افسانے

دُہرے موسموں کا عذاب

کوکب جمیل

مکتبۂ بھوپال ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۸۲ ۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی: ۷۴۷۰۰

"افسانے"

دُہرے موسموں کا عذاب

کوکب جمیل

مکتبۂ بھوپال پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۲ حیدری پوسٹ آفس کراچی ۷۴۷۰۰

MEHBOOB ALAM
Library In-Charge
M.P. URDU ACADEMY, BPL

حقوقِ اشاعت ثریّا جمیل کے نام محفوظ ہیں

مجموعے کا نام ——— ڈُہرے موسموں کا عذاب

مصنّف کا نام ——— کوکب جمیل

مصوّر ——— قمر عباس

خوش نویس ——— سید انوار حسین

تاریخِ اشاعت ——— دسمبر ۱۹۹۰ء

تعداد صفحات ——— ۱۶۰

طابع ——— ماس پرنٹرس ناظم آباد کراچی ۔ ۷۴۶۰۰

قیمت ——— ۵۰ پچاس روپے

ناشر ——— مکتبۂ بھوپال پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۸۲ نارتھ ناظم آباد، کراچی ۔ ۷۴۷۰۰

انتساب

بیگم زلیخا وہاج الحق خاں

اور

برادرم وہاج الحق خان

کوکب جمیل

فہرس

نقوش کے ایک افسانہ نمبر سے

ایک اقتباس

کچھ عرصے سے اردو افسانہ ایک ایسے دور سے گزر رہا ہے جس میں روایت کا تسلسل بھی ملتا ہے اور شکست و ریخت بھی۔ شکست و ریخت ہی سے دراصل موضوع اور ہیئت کے تجربات کا راستہ نکلتا ہے اور نئی روایت کی بنیاد پڑتی ہے۔ روایت کی شکست و ریخت، روایت کے گہرے شعور کے بغیر ممکن نہیں نئی روایت یا تجربے کی بنیاد، ظاہر ہے کہ روایت کے ٹوٹے پھوٹے عناصر اور ان کی ترتیبِ نو پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔

افسانے کے تمام عناصر ترکیبی میں زبردست انقلاب آچکا ہے۔ علامت اور تجرید کو جدید تکنیک میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جدید تکنیک کے جلو میں جدید طرزِ احساس بھی در آیا ہے جس میں ایک گونہ تازگی اور ندرت ہے چوں کہ جدید تکنیک کا براہِ راست تعلق بین الاقوامی صورتِ حال سے ہے اس لیے اس میں ہم عصریت کا عنصر نمایاں ہے اور قومی صورتِ حال سے ہم آہنگ ہے گو آج بھی اردو میں پرانے پیرایۂ اظہار سے نمو پانے والے افسانوں کی تعداد زیادہ ہے تاہم ادبی منظر پر نمایاں مقام جدت اور تجربے کو حاصل ہے۔

معاشرتی زندگی میں فرد یا اجتماع کے تمام جذباتی تقاضوں کی تسکین ممکن نہیں ابھی تک کوئی نظامِ زندگی ایسا وضع نہیں ہوا جو بالخصوص انفرادی محرومی کے احساس کو مکمل طور پر ختم کر سکے یہی وجہ ہے کہ ہماری ذات کے ناآسودہ پہلوؤں سے منسلک رومان کے کسی نہ کسی تصوّر کا وجود حقیقت ہے۔ ہمارے جیسے ملک میں جہاں ماضی اور حال پر انفرادی اور اجتماعی محرومیوں کے گہرے سائے محیط ہوں اُن میں رومان حقیقت سے کہیں زیادہ پرکشش معلوم ہوتا ہے۔

محبت کے ساتھ ازلی و ابدی ناکامی وابستہ ہے کبھی سماج، رسم ورواج، معاشرتی تعصبات اور طبقاتی امتیازات اس ناکامی کا سبب بنتے ہیں اور بعض مرتبہ خود فرد کی ذات میں جذبات کا ایسا معرکہ ہوتا ہے کہ محبت کی خواہش آسودہ نہیں ہو پاتی۔ (نذیر احمد)

میرے وہ بزرگ، عزیز اور دوست جن کی رحلت سے میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔

قاضی محمد نعیم فاروقی

اور

محمود علی خاں، اخلاق احمد صدیقی

ایک عرض ایک احوال

میرے ایک محترم کرم فرما، ادیب، افسانہ نگار اور نقّاد نے غالباً ۱۹۸۶ یا ۱۹۸۷ میں تحریری طور پر استفسار کیا تھا کہ میں کیوں لکھتا ہوں۔ میں نے ان کو یہ جواب تحریر کیا تھا:

"میں اظہارِ ذات کے لیے لکھتا ہوں۔ لیکن میری ذات میرے آس پاس جو کچھ ہے اس سے الگ نہیں ہے۔ میرے ماحول کے رنج، رکاوٹیں اور تکلیفیں مجھے ناپسند ہیں، میرے آس پاس جو نور و نکہت، رنگ اور خوشبوئیں بکھری ہوئی ہیں وہ میری ذات کا بہت عظیم حصّہ ہے، میرا سماج اور روایت میری ذات کے نشو و نما کا باعث ہے، سماج میں جو رکاوٹیں مجھے بحیثیت فرد کے تکلیف پہنچاتی ہیں ان کو میرا شعور دوسروں کے لیے بھی باعث تکلیف سمجھتا ہے اور یہ شعور میں نے دوسروں کے تجربوں کے گہرے مطالعے سے حاصل کیا ہے اور مشاہدے نے اس کو جلا بخشی ہے میں اس کو دوسروں تک

پہنچانے کے لیے فنی صداقتوں سے سنوار کر لکھتا ہوں، اور جب لکھتا ہوں تو اس سے دوسروں کو آگاہ کرنا اپنا منصب گردانتا ہوں۔

بعض صورتوں میں میری تحریریں وقت کے اندھیاروں کے باعث چھپائی کے مرحلوں سے نہیں گزر پاتیں، تو اس سے میں افسردہ اور رنجیدہ نہیں ہوتا۔ یہ اندھیرے باقی رہنے کے لیے نہیں اتارے گئے اصل حیثیت روشنی کی ہے جو دائم و قائم ہے۔ جس کو روکا جا سکتا ہے فنا نہیں کیا جا سکتا۔ اب نہ سہی کبھی تو یہ اندھیرے چھٹ ہی جائیں گے اور روشنی پھیل جائے گی۔ میں اسی روشنی کے پھیل جانے کی تمنا کی شمع کو روشن رکھنے کے لیے لکھتا ہوں۔ یہ ایک رمق جو میرے بطون سے پھوٹتی ہے اپنی یکسی کے باوصف دوسری روشنیوں کے ساتھ مل کر مشعل بنے گی جو بجھے سورج کو روشن کر دے گی۔ میں اسی لیے لکھتا ہوں۔

ان دنوں میں اپنا ناول "مٹھی بھر ہوا"، تحریر کرنے میں مصروف تھا اور کئی افسانے بھی انہی دنوں زیر تصنیف بھی تھے اور زیر غور بھی۔ کچھ لکھ چکا تھا کچھ لکھے جانے تھے۔ میں نے مندرجہ بالا تحریر میں ایک تو یہ جملہ تحریر کیا تھا کہ اندھیرے باقی رہنے کے لیے نہیں اتارے گئے۔ اصل حیثیت روشنی کی ہے جو قائم و دائم ہے اور یہ کہ کبھی تو یہ اندھیرے چھٹ ہی جائیں گے۔ ایسا ہوا۔ اندھیرے چھٹے، روشنی پھیلی۔

دراصل سیاسی نظریات ہوں یا اُن کو پھیلانے کے لیے ان میں ادبی نظریات کی روشنی کی چھوٹ دینے کا عمل، ان میں وقت کے تقاضے، انسان کی خواہشات اور ضروریات کا پرتو ہوتا ہے اور ایک انسانی گروہ دوسرے انسان کے گروہ کے استحقاق کو جب غصب کرتا ہے تو اپنے اس عمل کو حق بجانب اور فطری قرار دینے کے لیے، ادب، فنونِ لطیفہ اور علم و فکر سے کشید کی جانے والی دانش وری تک کو اپنے سہارے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیکن

خیر اور حق ایسی ہی روشنی ہے جس کو وقت کے وقت مقیّد تو کیا جا سکتا ہے فنا نہیں کیا جا سکتا۔

کل کے وہ نظریات کہ جو چاہے سیاسی ہوں یا اقتصادی، آنے والے وقت سے وہ مطابقت نہیں رکھتے تو ان میں سے ہی ان کا "رد" پیدا ہو کر اُن کو تبدیل کر دیتا ہے اب اگر نظریات پر شخصیات کی اجارہ داری نہ ہو تو ہر صاحبِ فہم انسان تبدیلیوں کو قبول کرنے سے نہیں ہچکچاتا، لیکن اگر شخصیت بنی ہی اُن نظریات کے تانے بانے سے ہو تو پھر وہ اُن سے ہی چمٹا رہتا ہے اِس خول سے نکلتا نہیں۔

ماضی قریب میں ادب میں ترقی پسند تحریک میں سے ہی ایک شاخ پھوٹی جس کو عوامی ادب کے حوالے سے جانا گیا، اس کا ایک نظریہ تھا جو سیاسی فکر کے ماتحت تھا۔ جو ادیب دانش ور، شاعر اور نقّاد، اس کو قبول کر کے اس کے قریب آئے ان پر وہ سخت پابندیاں بھی عائد ہوئیں جو ایسی صورت میں لازمی ہوتی ہیں کہ سیاسی نظریہ کے دائرے کے تحت جو ادب تخلیق نہیں کیا جاتا وہ باطل ہے اِس میں شریک اور اس کے قریب رہنے والے لوگوں کو جب انہوں نے اپنی فکر کو اس نظریاتی فانوس میں مقیّد نہ کرتے ہوئے اس دائرے سے باہر بھی دیکھا اور دیکھے ہوئے حقائق کو لکھا بھی تو پھر وہ سیاسی ادبی نظریات کے چودھریوں کی نظر سے گرا دیئے گئے اور ان کا حقہ پانی بند کر دیا گیا تو میرا بھی حُقّہ پانی بند کر دیا گیا۔

مجھے اس پر افسوس اس لیے نہیں ہوا، اور نہ ہے کہ ادبی اور سیاسی نظریات کی تاریخ میں ایسے واقعات درج نہیں کہ کل کے راندۂ درگاہ کو آتے والے وقت کے حوالے سے جب دیکھا گیا تو اس کے گُن گائے جانے لگے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ مجھے پہچانو۔ یہ درخواست ضرور رہی ہے کہ مجھے خود کو پہچاننے میں مدد دو، یہ لکھنے والے کا حق ہے کہ اس کی تحریر کو نظر انداز نہ کیا جائے، وہ اگر رطب و یابس بھی لکھ رہا ہے تو اس کو ٹوک کر سیدھی راہ پر لاؤ، ایسا نہ کرو کہ اس سے اس کے لکھتے رہنے کا حق بھی چھین لو۔

میرے ناول "مٹھی بھر ہوا"، کو ادبی تنقید کرنے والوں کے حلقوں میں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا نہ سہی! صرف یہ شکوہ ہے کہ میری غلطیوں سے تو مجھے آگاہ کیا جاتا اور نہ ہی میرے افسانوں کو جو درجہ اوّلا واعلا کے ضخیم ادبی جریدوں میں جگہ نہ پا سکے، ٹیڑھی نظر سے ہی سہی مگر دیکھا تک نہیں۔ مجھے نہ کل افسوس تھا۔ نہ آج ہے میں نے مختلف ادوار میں لکھے جانے والے چند افسانے منتخب کئے ہیں جو پیش ہیں۔ نقاد سے زیادہ پڑھنے والا، بہتر فیصلہ کر سکتا ہے۔ سو فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔

(کوکب جمیل)

پرواز

اس نے آہستہ سے چادر منہ پر سرکا دی اور تھمی ہوئی آنکھوں، ٹھہری ہوئی سانسوں کو سینے میں دبائے۔ آہوں کو ہونٹوں پر بھینچے۔ تھکے تھکے اور فراغت پائے قدموں سے وہ باہر نکل آیا۔

اکھڑی اکھڑی سانسوں کی خرخراہٹ جو ابھی کچھ دیر پہلے اندھیرے کمرے میں ہولے ہولے گونج رہی تھی۔ خاموش اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔ صرف ایک کمزور سی بتّی کی لالٹین جس کی چمنی کو گھٹیا تیل کی لَو نے کالا کر دیا تھا بھبھک رہی تھی۔

اس نے کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر سنسان مکان کے اندرونی حصّے پر نظر ڈالی۔ مگر اس کی نظر کو اداسی نے کہیں پناہ نہ لینے دی۔ مشرقی گوشے سے سرمئی سرخی مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ اونچے ٹیلوں اور گھنے درختوں کی اوٹ سے سورج بلند ہی ہونے والا تھا۔ چڑیاں چہچہانے لگی تھیں۔ ہلکا ہلکا شور کہیں دور سے بلند ہونے کی کوشش

کر رہا تھا۔ اس نے قریب کے دریچے سے نظریں باہر پھینک دیں۔ قریب کے جھونپڑے سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ باہر زندگی جاگتی جا رہی تھی۔ زندگی کی آنکھوں سے رات کا خمار رخصت ہو رہا تھا۔ اور ادھر ــــ ؟ اس کے گھر میں باہر کا تمام اندھیر اسمٹ آیا تھا اور اندھیرے کی شدت نے اس کے گھر کی زندگی کو۔ اس کے گھر میں ٹمٹماتے والی روشنی کو۔ ہڑپ کر لیا تھا، زندگی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس کی نظر کے سامنے گھر کے گوشے گوشے میں، نامراد آسودگی بیچاری خوش حالی، بال بکھیرے اپنی بیوگی کا ماتم کر رہی تھی اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا گھر دنیا ہے اور اس کے گھر کے باہر کا ماحول کرۂ ارض کے آس پاس تنا ہوا وہ پُر نور اور خوش رنگ شامیانہ ہے جس پر چاند ستارے دھندلے تصورات کی طرح بکھرے ہوئے ہوں یا پھر اس کا ذہن جاہل کا ذہن ہے اور گھر سے باہر کا تمام منظر گویا دور سے شہروں میں مسرتوں کی رونقوں میں لپٹا ہوا فہم و ادراک کا وہ اونچا شامیانہ ہے، جس کو دیکھا تو جا سکتا ہے چھُوا نہیں جا سکتا۔

ایک طویل مدّت تک بیمار رہنے کے بعد آج آخر شب میں اس کی بیوی مر گئی تھی رات سے اس کی حالت خراب تھی اور وہ رات بھر اس دھندلی لالٹین کی روشنی میں اس کے پاس بیٹھا رہا اور آج رات بجھتے بجھتے ہوئے چراغ نے سنبھالا لیا تھا اس کی بیوی تمام رات اپنی گزشتہ زندگی کے سہانے سہانے خوابوں کو دہراتی رہی۔ اور اپنی اُکھڑی سانسوں کے جھُرمٹ میں ہچکولے لیتی آواز کے دوش پر اس کی روح کو سوار کر کے ماضی کے سبزہ زاروں میں لے گئی۔ جاتے ہوئے ریگ زار اور اجاڑ مناظر بھی نظر پڑے۔ مگر آج کی رات وہ جان بوجھ کر اُن سے کتراتی گزر گئی۔ آج کی رات اس کی گفتگو میں نہ تلخی تھی نہ طنز۔ آج نہ جانے اس کا وہ طنز کہاں غائب ہو گیا تھا جو نچلے طبقے کی دھواں گھٹن مجبور لہجے میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتی ہے۔

شادی کے ابتدائی دنوں کے بعد یہ دوسری رات تھی۔ جس میں خیر بینی اور امرت گھلے ہوئے تھے جس میں پیار اور شوخی رچی ہوئی تھی۔ اس رات آئندہ کے لیے کچھ سوچا ہی نہیں گیا۔ نہ ایک ننھے منے سے گھر کی باتیں کی گئیں نہ آسائش و آرام کا تصور دہرایا گیا۔ بس یہی سوچا گیا کہ پچھلے دن کس طرح گزرے۔ اور آج رات نہ جانے وہ بھی اس تعفن اور گھناؤنے احساس کو کیوں بھول گیا تھا۔ جو مریضہ بیوی کے کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کے دماغ میں گھس کر نفرت اور ہمدردی کے ملے جلے احساس کو بیدار کر دیتا تھا۔ آج اس کو اپنی بیوی کے آس پاس تمام رات انہی خوشبوؤں کا ہالہ بنا ہوا معلوم ہو رہا تھا جو شادی کی پہلی رات اس نے محسوس کی تھیں کتنی ہی مرتبہ مریضہ نے خون بھرا متعفن بلغم تھوکا تھا۔ مگر آج اس کے بلغم پر اسے پہلی رات کے کھائے ہوئے خوشبودار پان کی پیک کا دھوکا ہوتا رہا۔ کھانستے کھانستے نڈھال ہو کر گر پڑنے کے باوجود آج رات اس نے یہ نہیں دہرایا کہ "خدا۔ اب تو اٹھا لے"! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی کے خزانے میں آنسو، آہیں، کراہیں اور نفرت انگیز کپکپی ختم ہو چکی ہیں، بس مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں رہ گئی ہیں۔

آج رات تمام نچڑے ہوئے بدن کا خون اس کے ہونٹوں پر کھنچ آیا تھا۔ تمام رات اس کی آنکھوں میں مدھر مدھر سنگیت بجتا رہا۔ آنکھوں کا بھیانک اندھیارا آج رات نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا ایک ہلکی ہلکی لذت پاش روشنی اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر لرزتی پلکوں کی اوٹ سے چھنتی رہی اور یہ روشنی ہر لحظہ تیز تر ہوتی رہی۔ اس اکھڑی اکھڑی درماندہ دھکی ہوئی آواز میں ستار کے ساز کی کھنک آتی گئی پھر کھوئی ہوئی مگر جانے والی برباد شدہ چیز۔ ماضی کے کھنڈر، ماضی کے شبستانوں میں اپنی بھرپور جوانی کے ساتھ ابھرتی گئی۔ آواز میں رس اور لوچ ہونٹوں پر نکھار۔ آنکھوں میں نتھری ہوئی روشنی اور رخساروں پر تابندگی، جوانی کی لچک لیے ابھرتی ہی رہی۔ اور رات کا سناٹا گہرا ہوتا گیا۔ گہرا ہوتا

گیا۔ پھر اندھیارا چھٹنے لگا۔ سناٹا اونگھنے لگا۔ پڑوس کی جھونپڑیوں سے چکی کی سہانی گھرگھراہٹ کے ساتھ غریب عورتوں کی آواز میں ، مایوسی اور اپنوں سے دوری کے شکوے شکایتوں کے گیت کی صورت میں ڈھل کر ہوا میں بہنے لگیں۔ بھوک اور آسائش کی طلب کی آنچ میں تپے ہوئے بول، آواز کی لہروں میں ابھرنے ڈوبنے لگے۔ صبح ہوتے ہوتے اُسے پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ اور جیسے چہرے کا تمام نکھار یا تو خونی بلغم میں شامل ہو کر باہر جا پڑا۔ یا پھر چہرے کی تمام توانائی اور قوت کھانسی کی چھنک سے اس کے ہاتھوں میں دوڑ گئی۔ مرنے والی نے اپنے دونوں سوکھے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا اور بالکل شکنجے کے کساؤ کی صورت میں اپنی گرفت میں لے لیا۔ یا جیسے کوئی سانپ کی منڈی پکڑلے تو سانپ اپنی تمام قوت سے پکڑنے والے کے ہاتھ کے آس پاس لپٹ جائے۔ دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا، جیسے وہ اس کے ہاتھ کی آڑ لے کر منہ سے نکل پڑنے والی سانس کو روک لینا چاہتی ہو۔ اس کے ہونٹ سرد ہو رہے تھے جیسے جمی ہوئی برف۔ ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں ستاروں کی جگمگاہٹ کھنچ آئی اور یہ جگمگاہٹ تیز ہوتی گئی۔ چہرے پر ایک نادم سی التجا پھیلتی گئی۔ چہرے پر سکون اور اطمینان کی لہر سی دوڑتی گئی۔ سانسوں میں ایک ایسا تیکھا پن آگیا جیسے ساز پر مضراب پڑنے سے ایک سیکنڈ کے ساٹھویں حصہ قبل معلوم دیتا ہے اور پھر یکا یک مضراب ساز کے قریب آیا اور قریب اور قریب تر! اور پھر نامحسوس تھرتھری پیدا ہوئی۔ ایک یونہی سی اُتھلی جھنکار کا شبہ سا ہوا۔ گویا مضراب ساز کو چھوتا ہوا گزر گیا ہو۔ کمرے میں تیرنے والی بوسیدہ ہوا میں ایک تھکا ہوا، درماندہ اُجاڑ اور دق کا مریض نغمہ تحلیل ہو گیا۔ اب چہرے پر ایک ٹھنڈا سکون اور پُر کیف اطمینان تھا۔ موت کی سردی سے پیشانی پر دو قطرے ابھرے اور مساموں سے نکل بھاگنے والی گرمی میں کھو گئے۔!

وہ جیسے اس حادثے کے لیے تیار تھا۔ اُس نے ایک طرف گر جانے والے ہاتھوں

کی گرفت سے جو، اب گرفت نہ رہی تھی، اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ایک طرف ڈھلکے ہوئے چہرے کو سیدھا کیا۔ پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ہونٹوں کو چھوا۔ بے ترتیب بالوں کو سنوارا۔ بکھرے ہوئے ہاتھ پیروں کو سیدھا کیا۔ اور پاؤں پر پڑی ہوئی چادر کو منہ پر سرکا دیا اور تھکے تھکے مگر فراغت اور فرصت پائے ہوئے قدموں سے کمرہ کے دروازے پر آگیا۔

پڑوس میں رہنے والے کلرک کے دروازے پر دودھ والا چیخ رہا تھا۔ اس وقت اس کے احساسات اور تخیل کے دو حصے ہو گئے تھے۔ ایک حصہ تو ابھی تک ماضی کے انہی شبستانوں، انہی سبزہ زاروں میں محوِ خرام تھا۔ جہاں اس کی بیوی اپنی اکھڑی سانسوں کے جھرمٹ میں ہچکولے لیتی آواز کے دوش پر سوار کرا کر اسے لے گئی تھی۔ اور ایک جو اس کے ساتھ تھا، وہ نہ جانے کیوں نظر کے سامنے آجانے والی چیزوں اور شکلوں کے تانے بانے سے اُلجھ کر گر گر پڑ رہا تھا۔ پڑوسی کے گھر میں اس کا ننھا بچہ رو رہا تھا اور کلرک کی بیوی سوئی بچی کو کوس کوس کر بیدار کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں چڑچڑاپن اور کڑواہٹ تھی۔ ایک ایسی بیزاری تھی۔ ایک ایسا شکوہ تھا جیسے اسے زندہ رہنے پر کوڑے مار مار کر مجبور کیا جا رہا ہو۔ وہ چیخ رہی تھی۔

"اللہ کرے کم بخت تجھے ڈھائی گھڑی کی آجائے ایک ہیں اُٹھ بھی چک۔ وہ دروازے پر تیرا باوا۔ دودھ والا چیخ رہا ہے۔ یا خدا۔ تو ان سب بچوں کو موت دے دے یا پھر مجھے اُٹھا لے۔ کم بخت سور کی دھاڑ کی طرح پل رہے ہیں۔"

اس کے تخیل کا ایک حصہ اسی تانے بانے میں اُلجھ گیا وہ سوچنے لگا "یہ آخر ہر طرف بیزاری کیوں چھائی ہوئی ہے؟"

اتنے میں ایک بچی ناک سُڑکتی میلی آنکھیں ملتی ہوئی ہاتھ میں دودھ کا برتن لیے دروازے کے باہر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گندگی کا کوئی کیڑا پھسل کر فرش پر آپڑا ہو۔ اس افلاس اور بھوک کے نمونے کو دیکھ کر اسے اپنا افلاس اور ازدواجی دُکھ یاد

آتے ہی لگا تھا کہ اُس کے پڑوسی کلرک نے گھر سے نکل کر اُسے آواز دی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر دریچہ میں جُھک گیا۔

"کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بھئی اب کیسی طبیعت ہے۔؟" بیڑی کا لمبا سا کش لگاتے ہوئے پڑوسی نے پوچھا۔

"مر گئی وہ تو" اس نے بہت اطمینان اور آسانی سے یوں جواب دیا گویا وہ اپنی بکری یا مرغی کے مر جانے کی اطلاع دے رہا ہو۔ مگر اس کا پڑوسی بوکھلا گیا۔

"ایں! کیا کہتے ہو۔؟" پڑوسی نے ہاتھ سے بیڑی پھینک دی یا وہ خود بخود گر پڑی۔ "ہاں۔ ابھی سویرے ہی" اس مرتبہ اس کے لہجے میں ایک گھناؤنا درد تھا "نہیں جی۔!" اس کا پڑوسی شاید مذاق سمجھ رہا تھا۔

"خدا کی قسم۔!" اس نے بالکل اس طرح قسم کھائی گویا خدا کی قسم کے آگے وہ یہ کہنے والا ہو کہ اب اگر تم نے یقین نہ کیا تو میں رو دوں گا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑوسی کو یقین آگیا۔ "میاں عجیب آدمی ہو تم بھی، تم نے اطلاع کیوں نہ دی" اس نے رُکے رُکے لہجے میں جواب دیا۔

"اب دے تو رہا ہوں، اس نے اُونگھتے ہوئے پڑوسی کو جواب دیا۔

"میاں جب طبیعت بگڑی تھی تو گھر میں سے کسی کو بلا لیا ہوتا"،

"میں نے سوچا تکلیف ہو گی"

"ہوں" تکلیف ہو گی! اچھا خیر، تم نیچے اُتر آؤ۔ میں تمہاری بھابھی اور ننّو کی اماں کو اوپر بھیجتا ہوں" پڑوسی بڑبڑاتا اندر چلا گیا۔

وہ دریچے سے ہٹ کر پلنگ تک آیا، لالٹین ابھی تک جل رہی تھی اس کی آنکھیں لالٹین کی پھیکی روشنی پر جم گئیں۔ وہ سوچنے لگا۔ "یہ ابھی تک بجھی کیوں نہیں؟ اس کو

بھی بجھ جانا چاہیئے تھا۔ اس کے احساسات اور تخیل کا وہ حصّہ جو اُس کے پاس تھا۔ بالکل اس طرح پھڑپھڑا رہا تھا جیسے اکثر جاڑوں کی طویل سیاہ رات میں جب کہ اس کی بیوی اپنے میکے میں ہوتی تو اس کی اپنی طبیعت پنجرے میں بند پنچھی کی طرح پھڑپھڑا اٹھتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے خیالات مجتمع ہو جائیں سکون اور شانتی کے ساتھ۔ ! مگر اس کے احساسات اور تخیل کا نصف حصّہ۔ !!

وہ حصّہ، جو ماضی کے سبزہ زاروں اور شبستانوں میں ابھی تک محوِ خرام تھا۔ وہ سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔

اس تکلیف کی شدّت سے اس کا دل بالکل اس طرح تپ اٹھا جیسے سینہ پگھل رہا ہو اور آخر اس کے پاس رہ جانے والا تخیل اور احساس بھی ماضی کے سبزہ زاروں میں ٹہلتے ہوئے گم شدہ خیالات کو لینے جا پہنچے۔ بالکل یوں جیسے اکثر وہ اپنی بیوی کو اس کے میکے لینے جا پہنچتا تھا۔

وہ لاش کے پاس پڑی ہوئی اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس پر وہ تمام رات بیٹھا ہوا، بیوی کی گرم اور سرد سانسوں سے کھیلتا رہا تھا۔ جب اس کے احساسات ماضی کے شبستانوں اور سبزہ زاروں سے واپس لوٹنے لگے تو راستہ میں پڑنے والے ریگ زاروں پر سے گزرتے ہوئے اس کے آنسو بہہ نکلے۔

یہ ریگ زار اس کی زندگی میں وہاں سے شروع ہوئے۔ جب اُس کی بیوی نے اپنی ساس کے مرنے کے بعد گھر بار سنبھالا اور یہیں سے دونوں کو معلوم ہوا کہ دونوں میاں بیوی ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔ آہستہ آہستہ بیوی گھر گرہستی کے کاموں میں الجھتی گئی۔ اپنی تزئین و آرائش سے بے نیاز ہوتی گئی۔ اور وہ کمانے کی مشین بنتا گیا۔ نہ جانے کب اور کس طرح انھوں نے یہ بھی طے کر لیا کہ آئندہ زندگی کے لیے کچھ پس انداز کرنا ضروری ہے۔ نجانے کب بچّوں کا بار ہمارے کاندھوں پر آپڑے۔ مگر اس مقصد میں

کام آنے سے پہلے ہی یہ تھوڑی سی جمع شدہ پونجی خرچ ہو گئی ۔

اس کے خاندان میں ایک رشتہ دار کی شادی تھی ۔ اور اس میں ان کی شرکت ضروری تھی اور پھر "نیگ بیوہار" کے طور پر کچھ دینا بھی ضروری تھا ۔ باوجود سب کچھ دیتے دلاتے کے خاندان میں ان کو وقعت کی نظر سے نہ دیکھا گیا ۔ ان کے معمولی تحفہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے دو جان میاں بیوی، آمدنی اور کنجوسی پر تنقید و تبصرے کیے گئے یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ بجلی کی تیز روشنی کے سامنے دیئے کی جھلملاتی لو مدھم تھی ۔ اور پہلی مرتبہ ان دونوں کو احساس ہوا کہ " زندگی کس قدر دشوار راہوں کا نام ہے "۔

لاش پر ڈھکے ہوئے کپڑے پر بیٹھی ہوئی ایک مکھی اُڑ کر اس کی ناک پر آ بیٹھی اور وہ یکایک چونک پڑا ۔ مکھی اُڑی اور کان کے پاس سے بھنبھناتی باہر نکل گئی ۔ اور اس کی آنکھیں پھر دھندلی لالٹین پر جا کر جم گئیں ۔

وہ ضلع کی تحصیل میں ایک معمولی کلرک ہی تو تھا اس کی ۔ آمدنی جو کچھ تھی اس کے کچھ برابر اخراجات بھی تھے ۔ ان اخراجات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نہ اس کی بیوی کوئی فرمائش کر سکتی تھی اور نہ خود ہی وہ کچھ اپنی تفریح اور من مانی خوشی پر خرچ کر سکتا تھا ۔

ایک محفلِ میلاد میں اس کی بیوی کی ملاقات تحصیل دار کی بیوی سے ہوئی ۔ اور یہ ملاقات اس کے حسن اور معصومیت کی سفارش سے بظاہر گہری دوستی اور بباطن شدید دشمنی میں تبدیل ہو گئی ۔ اور یہ دشمنی اس وقت ظاہر ہوئی جب اس کی بیوی نے لجاتے شرماتے اس سے ایک معمولی سی ساڑھی کی فرمائش کی ۔

اور وہ ساڑی کی فرمائش جیسے اس کے سینے پر ایک دہکتا ہوا انگارہ بن کر چپک گئی ۔ اب اس کی بیوی آہستہ آہستہ پھر اپنی آرائش و زیبائش کی طرف لوٹ رہی تھی لیکن اس نے اپنی بیوی کو ہر اس ملاقات کے بعد اداس ہی پایا جو وہ تحصیل دار کی بیوی سے کر کے آتی ۔ وہ اپنی بیوی کی زیادہ فرمائشیں پوری نہ کر سکا اور آخر اُسے یہ سوچنا ہی پڑا "کہ یہ اپنی

حاکم محض اپنے جذباتِ امارت و نمائش کی تسکین کے لیے غریبوں، لاچاروں، مجبوروں کو کس طرح کھلونا بنا کر کھیلتے ہیں۔ یہ احساسِ کمتری کے شکار بڑے لوگ۔ جو اپنی دانست میں بڑے مقام پر کھڑے ہو کر اپنے سے چھوٹوں کو اپنے قریب بلانے کے لیے اشارے کرتے رہیں۔ راہیں بتاتے ہیں۔ اور پھر اِن پُرپیچ راہوں پر نہ چل سکنے کی وجہ سے اُن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے زخموں سے کھیلتے ہیں۔ یہ انسانوں کو طبقوں اور فرقوں میں تقسیم کرنے والے بڑے لوگ۔ یہ امتیاز اور نجابت کے دائرے قائم کرتے والے سفاک لوگ معصومیت اور انسانیت کے قاتل ہوتے ہیں۔"

لیکن یہ خیالات اس کی بیوی کو بیمار ہونے سے نہ روک سکے۔ اس کی ہنس مکھ۔ ہمیشہ مسکراتے والی اپنے میں مگن رہنے والی حسین بیوی۔ اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کی تکمیل نہ ہو سکنے کی وجہ سے چڑچڑی ہو گئی۔ گھر گرہستی کا خیال رکھنے والی ہر چیز سے بیزار نظر آنے لگی۔ اس کی تمام چستی و چالاکی کو جیسے کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ وہ تو بس ہمیشہ خوابوں میں ڈوبی رہتی۔

جب کبھی وہ اس زمانے میں اپنی بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ایسا معلوم ہوتا جیسے اُس نے دور بین کو اُلٹا کر کے دیکھنا شروع کر دیا ہو۔ کوسوں دور۔ اُن آنکھوں میں اس کو ایک سہانا پن رچا ہوا معلوم ہوتا۔ ایک بہار آئی ہوئی معلوم ہوتی مگر اُن آنکھوں کی پتلیوں کے باہر اس کو کالے حلقے ہی نظر آتے۔ جب وہ اپنے مستقبل کے بارے میں رات کی تنہائی میں اپنی بیوی سے کچھ کہتا تو وہ چہک چہک کر باتیں کرنے لگتی۔ وہ تخیّل میں ایک بنگلہ آباد کرتی۔ ایک سہانے ماحول میں ہلکے نیلے رنگ کا چھوٹا سا بنگلہ جس کے سامنے ایک ڈارک بلیو کار کھڑی ہو۔ اور وہ سامنے لان پر بیٹھے ہوئے شام کی چائے پی رہے ہوں۔ ہلکی گلابی ساڑھی اور سیاہ شیروانی۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دو شیزگی نکھر آتی۔ چہرے پر کنوارپن کا نکھار آجاتا۔ اور پھر دل میں وہی تیر و نشتر! "خدا

کرے اس بوڑھے کو قبر میں چین نہ آئے کم بخت نے کس بھک منگے اُجڈ کے پالے ڈالا ہے۔"

وہ اپنے باپ کو کوسنے لگتی اور اپنے شوہر کو گالیاں دیتی۔

اور پھر ایک دن اُس نے ایک سوکھے ہوئے بچّے کو جنم دیا ایسا بچّہ جیسے چچوڑی ہوئی ہڈّیوں پر کھال منڈھ دی گئی ہو۔ جو صرف چند دن کی زندگی کے بعد اس بنگلے کو سدھار گیا جو اس کی ماں کے تخیّل میں آباد تھا۔ جہاں وہ ایک صحت مند بچّے کی شکل اختیار کر کے آیا کے ساتھ چھوٹی سی گاڑی میں پڑا اونی کپڑوں میں لپٹا ہوا لان کی سیر کر رہا ہوگا۔ یا پھر ننھی سی مچھّر دانی میں سویا ہوا چُسنی چوس رہا ہوگا۔ بچّے کی پیدائش کے بعد اس کی بیوی کو پلنگ سے اُٹھنا نصیب نہ ہوا۔ وہ قے اور دستوں کے خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر دِق کی سرحدوں میں داخل ہو گئی۔ اس کے چڑچڑے پن میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ زیادہ تخیّل پرست ہو گئی۔ وہ اس کے لیے دوائیں لاتا مگر وہ پینے سے انکار کر دیتی۔ وہ اسے اچھے اچھے حکیموں کے پاس لے گیا اور اُس نے ضلع کے بڑے ڈاکٹر سے بھی علاج کرایا مگر مرض بڑھتا گیا۔ اب اس کا معمول ہو گیا کہ وہ دن بھر دفتر میں کام کرتا شام کو آ کر گھر صاف کرتا، بیوی کے بلغم سے اَٹے ہوئے اگالدان صاف کرتا۔ خراب ہو جانے والا بستر بدلتا، روٹی پکاتا اس کے لیے دوائیں لاتا اور پھر اس کی دلجوئی کرتا اور کبھی کبھی جب کوئی رشتہ دار منّت سماجت پر آ جاتی تو کچھ دن کو یہ بار ہلکا ہو جاتا۔

ایک دن شام کو جب اس نے بیوی کو آ کر سنایا کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ ہونے والا ہے تو اس کی بیوی کے چہرے پر یکایک خون دوڑ آیا، ہونٹوں پر مجروح مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے کہا "ذرا مجھے اُٹھا کر بٹھا دو۔ مجھے آج احساس ہوا کہ تم میرے لیے کتنی تکلیفیں اُٹھاتے ہو۔" اس نے یہ بھی کہا کہ "اب تم کب تک یوں میرے لیے تکلیفیں اٹھاتے رہو گے۔ تم تو اپنی آسائش کے لیے ایک اور شادی کر ڈالو۔" اور اُس نے بیوی کو پیار بھرے غصّے سے ڈانٹ دیا۔ اور کہنے لگا "اب تم جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔ پھر ہم ایک آرام دہ زندگی گزاریں گے۔"

اور وہ پھر اپنے مستقبل کے نہ پورے ہونے والے سُنہری رُوپہلی خوابوں میں کھو گئی۔
وہ شام اور وہ تمام رات ایسی شادماں گزری جیسے اب وہ کل ہی سے اُٹھ کر پھر ویسی ہی ہو جائے گی جیسی شادی کے چند دن بعد تک رہی تھی۔

مگر جب چند دن بعد شام کو اس نے بیوی کے ہاتھ پر تنخواہ لاکر رکھی اور اس نے نوٹوں کو ہاتھ میں لے کر گنا تو اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کے بدن میں دوڑنے والا خون یکایک کالا پڑ گیا ہے۔ اور اس کے ہاتھوں سے چند دس، پانچ اور پچاس کے نوٹ پھیل کر بستر پر گر گئے۔ اور اس کے بعد سے اس کی حالت اور بھی بگڑ گئی۔ ڈاکٹر نے دق کا آخری درجہ بتاتے ہوئے کسی "سینی ٹوریم" لے جانے کا مشورہ دیا۔ مگر وہ بے چارہ چند معمولی نوٹوں کی سرسراہٹ میں گم صُم کھڑا رہ گیا۔

وہ اپنے بکھرے ہوئے احساسات اور تخیّل کو ایک مرکز پر لا ہی رہا تھا کہ اس کے پڑوسی کلرک نے اسے پھر چونکا دیا۔

"ارے بھئی! کہاں ہو؟" اس کا پڑوسی زینہ پر کھڑا ہوا، اسے آواز دے رہا تھا اور وہ چونک کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ بالکل اس طرح جیسے اس کمرے میں اس کی موجودگی مجرمانہ تھی "یہ۔ ہوں۔" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آنسو صرف پلکوں تک آکر تھمے ہیں۔

"اب تم نیچے آجاؤ محلّے کی کچھ عورتیں آرہی ہیں۔ نیچے سب محلّے والے بھی جمع ہو گئے ہیں۔"

وہ نڈھال نڈھال قدموں سے اس کے ہمراہ نیچے آگیا، کچھ محلّے والوں کی آوازوں کے اتار چڑھاؤ پر کپکپاتے تعزیتی جملے ہوا میں بکھر گئے۔ وہ نیچے پڑے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گیا کچھ لوگوں نے ہمدردی سی جتانی چاہی، کچھ اور لوگ کھوکھلی تعزیت کرتے رہے۔ اسے بیٹھتے ہی یاد آیا کہ کمرے میں لالٹین ابھی تک جل رہی ہوگی۔ اسے

بجھا دینا چاہیے تھا وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ ازدواجی تلخیوں کے ساتھ مستقبل کا بھیانک تصوّر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اسے شام کو روٹی پکانا تھی۔ مگر یہ سب کچھ تو وہ ایک مدّت سے کر رہا تھا۔ اسے اس وقت بالکل ایک۔ ایسی سُستی اور بھیانک بیزاری کا احساس ہو رہا تھا جس میں وہ خوشی بھی ملی ہوئی تھی جو ایک مدت تک غیر مستقل کلرک رہنے کے بعد مستقل ہو جانے کے حکم کے ملنے پر ہوئی تھی۔ اس نے اپنے شانے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی انگلیاں اپنے پھٹے ہوئے قمیض میں الجھیں۔ "اور یہ قمیض بھی تو سینا ہے"۔ اس نے سوچا۔ اسے محسوس ہوا کہ دو انجانے ہاتھ مہندی میں رچے ہوئے اس کے پھٹے ہوئے قمیض کو سی رہے ہیں۔ اس نے پھر ہاتھ پھیرا اور اپنے پھٹے ہوئے قمیض کی سرسراہٹ دس دس کے، پانچ پانچ کے اور پچاس کے نوٹوں کی سرسراہٹ میں کھو گئی۔ اسے بدن پر ننھے ننھے کیڑے سے رینگتے ہوئے محسوس ہوئے اور اس کا تخیّل قبر کی تاریکی میں پڑی ہوئی لاش پر رینگنے والے کیڑوں کی طرف جا پہنچا۔ اسے اپنی بیوی کا کھوکھلا جسم یاد آ گیا۔

سامنے کچھ مزدور سر پر مٹّی کی ٹوکریاں رکھے اس جھونپڑے کی طرف جا رہے تھے جو پڑوس کا گوالا بنوا رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ بوڑھی مٹّی کس کام کی؟ صدیوں سے اس کا رَس چُوسا جا رہا ہے۔ یہ مٹّی جھونپڑے کی دیواروں کے نئے سانچے میں ڈھل کر توانا تن درست تھوڑا ہی ہو جائے گی۔ یہ ان اینٹوں کو کیا فائدہ پہنچائے گی۔ جو اس سے اس وقت تو لپیٹ جائے گی۔ مگر پھر بارش میں یہ کھوکھلی اور بیمار مٹّی اپنی آغوش سے اینٹوں کو جُدا کر دے گی اور اس کی نگاہیں سامنے کے پختہ مکان پر جا تھمیں جو ایک سیٹھ نے سیمنٹ سے بنوایا تھا۔ بلند و بالا مکان۔ اور ساتھ ہی اپنی بیوی کے کھوکھلے جسم کے مقابلے میں اس کی آنکھوں میں ایک فربہ اور تن درست جسم پھر گیا۔ جس پر بے شمار کیڑے بجبجا رہے تھے۔ اور یہی احساس اُسے اس وقت ہوا جب قبرستان میں اپنی بیوی کی قبر

کو مٹی دیتے ہوئے پاس بنی ہوئی ایک پختہ اور شان دار قبر کو اس نے دیکھا تھا۔ وہاں اُسے یہ بھی خیال ہوا کہ یہ غلط ہے کہ مرنے کے بعد سب برابر ہو جاتے ہیں اور بے نشان مٹی میں مل جاتے ہیں۔ ایسی پختہ قبریں بھلا کب مٹتی رہیں؟ یہ تو لوح مزار کے ساتھ موجود رہتی ہیں اور اپنے مُردوں کو بھی زندہ رکھتی ہیں۔ سیمنٹ مٹی میں نہیں ملتی۔ البتہ مٹی مٹی میں مل جاتی ہے۔

(۱۹۴۵)

بوتل کا دھواں

بیگم نیاز آج بھی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ کلب کی فضا پر چھائی ہوئی تھیں
ابھی وہ کرنل کے گروپ میں بیٹھی تھیں۔ اور اب وہ رفیق کے ساتھیوں کے پاس جا پہنچیں۔ شام کا اندھیرا اب تیزی سے پھیلنے لگا تھا ٹینس کورٹ کی رونق ختم ہو چکی تھی۔ برج پارٹی پورے زوروں پر تھی۔ نیاز صاحب بلیرڈ روم میں موجود تھے کیوں کہ اُن کے سگار کی مخصوص خوشبو کا لطیف جھونکا ادھر ادھر سے ہی کبھی کبھار آ جاتا تھا بلیرڈ روم کی مخملیں میز پر گیندوں کے ٹکرانے کی آواز بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ آج پھر اس کی طبیعت اُداس تھی۔

"یہ موسم کی تبدیلی کا سبب ہوگا۔ اُس نے سوچا لیکن یہ موسم تو کئی سال سے ہر سال اس کو یونہی آکر ستا رہا ہے۔"

برآمدے کے دوسرے کونے پر بیگم نیاز کا قہقہہ گونجا اور اس کے خیالات کی رَو اُدھر چلی گئی۔ بیگم نیاز اُس کی رشتے کی پھوپھی ہوتی ہیں۔ وہ بھی خوب ہیں۔ اُن کی عمر چالیس پینتالیس کے لپیٹے میں ہوگی لیکن جوانی کا رُوپ اور شباب کی آنچ اب بھی ان پر بڑے تیکھے سائے ڈالے ہوئے ہے۔ سچ پوچھئے تو جوانی تو گویا اُن کے پلّو میں بندھی معلوم ہوتی ہے۔ نیاز صاحب اُن پہ پروانہ وار نثار ہوتے ہیں اور وہ دوسروں پر فدا ہوتی رہتی ہیں اُن کے ایک لڑکی کے سوائے کوئی اولاد نہیں اور اس لڑکی کو بھی اُن سے جدا ہوئے کوئی پانچ سال ہو چکے ہیں۔ وہ ایک عام سے نوجوان کے ساتھ جس کو بقول بیگم نیاز سوائے کاغذ خراب کرنے کے اور کوئی خبط نہ تھا، شادی کر کے ان سے الگ ہو چکی ہے۔ بیگم نیاز نے کس محبّت، محنت اور چاؤ سے اپنی بچّی کی پرورش کی تھی۔ اس کے مستقبل کے بارے میں انھوں نے کیا کیا خیال باندھے تھے اور جب زرینہ اُن کی بیٹی جوان ہوئی تو وہ کلب کی رونق ہی کیا، شہر کی رونق تھی۔ مگر بیگم نیاز اس کو کسی بڑے افسر سے بیاہنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے اس کے امیدواروں کی ایک فہرست بھی بڑی احتیاط سے تیّار کر لی تھی۔ کانونٹ کی تعلیم ختم ہوتے ہی زرینہ کو انہوں نے کلب کا ممبر بنوا دیا تھا اور کلب میں زرینہ کے آس پاس اس کے امیدواروں کا جمگھٹا لگا رہتا اور بیگم نیاز یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوتیں، لیکن بقول بیگم نیاز کے وہ جو قسمت کا لکھا ہے وہ ہو کر رہنا ہے، اور یہ سب قصور نیاز صاحب کا تھا نہ وہ اپنے لئے ایک پرسنل اسسٹنٹ کی آسامی کا اشتہار دیتے اور نہ خالد کا اس آسامی پر تقرر ہوتا۔ نہ اس کا گھر پر آنا جانا ہوتا اور نہ اس کی زرینہ سے ملاقات ہوتی۔ اس سلسلے میں افتاد یہ

آپڑی کہ ایک دن کلب میں ایک ڈرامہ کھیلے جانے کی تجویز ہوئی تو زرینہ نے وعدہ کرلیا کہ وہ ڈرامہ لکھے گی۔

"ارے سچ تم لکھو گی؟" بیگم نیاز کی تو باچھیں کھل گئیں۔ ان کی بیٹی تو ماشاءاللہ ڈراماٹسٹ بھی ہے لیکن جب زرینہ نے بیگم نیاز کو گھر پر بتایا کہ اصل ڈرامہ تو رؤف خالد لکھے گا۔ جو ایک معروف ادیب ہے تو اُن کو یہ بات گوارا نہیں ہوئی اور بالآخر ایک دن کھانے کی میز پر وہ گلاس جس میں زرینہ نے بیگم نیاز کو پانی بھر کر دیا تھا یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ اُن کے ہاتھوں سے اس وقت گر کر ٹوٹ گیا۔ جب زرینہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ رؤف خالد سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اسی شب بیگم نیاز کو دل کا دورہ پڑا! اور بالآخر زرینہ نے بڑی خاموشی سے رؤف خالد سے شادی کرلی۔ اور نیاز صاحب نے رؤف خالد کو اپنے محکمہ سے دوسرے محکمہ میں منتقل کرا کے اس کو ایک معقول سی ترقی بھی دلوادی اور بیگم نیاز کے قہقہوں سے کلب کی فضائیں پھر گونج اٹھیں اور ان کی حشر سامانیوں سے محفل کی رونق پھر دوبالا ہونے لگی لیکن اب تو بیگم نیاز کی مقبولیت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوگیا تھا۔ اب وہ غیر شادی شدہ نوجوانوں کے ساتھ زیادہ مصروف رہتیں۔ نوجوانوں کو اپنے مکان پر دعوتوں پر مدعو کرتیں۔ کانونٹ اور کالج کی لڑکیوں سے رابطہ رکھتیں۔ اور گویا اُن کے ذہن کی پاکٹ بک میں ہر ایک نوجوان سرکاری افسر اور وہ بھی جو افسر بننے والے ہیں۔ اپنے پورے قدوقامت، رنگ روپ، انداز، طور طریق اور طبیعت و رجحان کے ساتھ محفوظ رہتے اور اسی پاکٹ بک کی دوسری طرف کانونٹ اور کالج کی خوبرو۔ خوب صورت اور مہذب لڑکیوں کی ایک ایک نس کا ذکر محفوظ رہتا۔ جس کو وہ بڑی خوبی اور فن کارانہ مہارت سے جب نوجوانوں کی محفل میں سناتیں۔ تو محفل کے تمام نوجوان اُن کے نہ صرف قائل ہو جاتے۔ بلکہ اکثر اُن کی جنبشِ

ابرو کے منتظر رہتے۔ گزشتہ پانچ سال میں بیگم نیاز نہ جانے کتنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو شادی کے رشتے میں منسلک کر چکی تھیں۔ اس علاقہ کا شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہو جہاں کا نوجوان افسر اور اس کی خوبرو بیوی بیگم نیاز کی مرہونِ منّت نہ ہوں۔

"یہ دوسری بات تھی کہ شادی کے بعد بعض نوجوان افسر یا تو بیگم نیاز سے خواہ مخواہ شاکی رہتے یا دل ہی دل میں اُن سے جلنے لگتے یا اُن کی نوجوان بیگمیں زندگی بھر کے لیے جہاں اپنے دل کے ایک گوشے میں ایک کھولا بسرا سہانا خواب چھپائے رہتی وہیں بیگم نیاز کی نوکیلی اور دودھاری تلوار کی طرح کاٹ کرنے والی تصویر بھی فریم کی ہوئی سجی رہتی"

کچھ بھی ہو کلب میں اور اس شہر کی سوشل زندگی میں بیگم نیاز کی شخصیت ایک محور کی حیثیت رکھتی تھی۔ سب بیگم نیاز کے گرویدہ رہتے تھے اور اعلیٰ طبقہ کی دوسری شادی کے امیدوار لوگ تو بیگم نیاز پر جان چھڑکتے تھے اور اُن کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اُن کے لیے اپنے افسرِ اعلیٰ کا سا حکم رکھتا تھا۔ اگر برج کی میز پر بیگم نیاز کسی ایسے ہی افسر کو اپنے غلط مشوروں سے ہرواتے پر تُل جاتیں تو وہ جاتے بُوجھتے بھی ہارنے میں مسرت محسوس کرتا چلا جاتا۔ پھر نوعمر تعلیم یافتہ حسین لڑکیوں کے غریب والدین تو گویا بیگم نیاز کی جنبشِ ابرو پر اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار رہتے۔ ایسے والدین کے لیے بیگم نیاز مصر کے گم شدہ خزانوں کی چابی کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔ جس کے تقدیر کے زنگ آلود تالے میں لگتے ہی مستقبل کا سہانا دروازہ کھلنے کی اُمید ہوتی تھی۔ اسی مستقبل کی جس کے اندھیرے میں اُن کی بیٹی اپنی شمعِ حُسن سے اُجالا کر دے گی۔ ایسے ہی تو اس کے والدین بھی تھے۔ ابھی اُس نے کانونٹ اور کالج کی تعلیم ختم ہی کی تھی کہ

اس کے والد کو جو ایک دُور دراز تحصیل کے تحصیل دار تھے یاد آیا کہ بیگم نیاز تو ان کی بہن ہوتی ہیں اور جب بیگم نیاز نے اُسے دیکھا تو کہا تھا کہ وہ زرینہ کی جگہ اسی کو اپنی بیٹی سمجھیں گی اور جب سے ہی وہ بیگم نیاز کی سرپرستی میں ہے۔ برآمدے کے دوسرے سرے سے جہاں کرنل جبّار اپنی محفل جمائے بیٹھے تھے۔ کرنل جبّار کا بھاری بھرکم قہقہہ میگاٹن بم کے دھماکے کی طرح پوری فضا میں پھوٹ بہا شاید انہوں نے اپنے تجربات کی کوئی کہانی ختم کر ڈالی تھی۔ یوں تو بیگم نیاز کی کرنل جبّار سے اَن بن نہیں تھی لیکن کرنل جبّار کی مونچھوں سے وہ ضرور جلتی تھیں اور کرنل جبّار کو کسی نے کبھی بیگم نیاز سے براہِ راست بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بات یہ تھی کہ کرنل جبّار سدا کے کنوارے تھے یہی بات شاید بیگم نیاز کی پسندیدہ نہیں تھی لیکن بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ کرنل جبّار اور بیگم نیاز ایک دوسرے کے پرانے چہیتے ہیں اور وہ تو نہ جانے کیا بات ہوئی کہ بیگم نیاز بیگم جبّار نہ بن پائیں۔ ورنہ کرنل جبّار تو ان کے لیے سب کچھ نثار کرنے کو تیار تھے لیکن اس کے باوجود کرنل جبّار اور مسٹر نیاز میں گاڑھی چھنتی تھی اور اس بات پر بیگم نیاز کچھ جلتی بھی تھیں لیکن کسی نے کبھی کرنل جبّار کو نیاز صاحب کے گھر جاتے نہیں دیکھا۔ بس ان دونوں کی دوستی کلب کی شام سے شروع ہوتی اور کلب کی رات میں ڈوب جاتی۔ البتہ کرنل جبّار بیگم نیاز کی سالگرہ پر ہر سال ایک خوب صورت تحفہ ضرور بھجوا دیتے ایک دن کرنل جبّار اپنے ایک بھتیجے عزیز کو کلب میں لائے۔ بڑا خوب صورت سا نوجوان تھا۔ وہ اسی سال انتظامیہ کے اعلیٰ امتحان کی تربیت ختم کر کے اس ضلع میں تربیتی تقرر پر آیا تھا اور جسے دیکھتے ہی بیگم نیاز نے اس کو کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے آہستہ سے پوچھا تھا "کہو پسند ہے تم کو یہ نوجوان ؟"

"لڑکا بڑا شائستہ۔ خوبرو۔ مہذب اور نفیس مزاج کا تھا لیکن۔ اور

وہ اس "لیکن" سے آگے ہی تو کچھ نہیں سوچ سکتی تھی۔

اس "لیکن" کے آگے سے ہی تو وہ موڑ شروع ہوتا تھا جس پر
وہ بار بار اس گھٹنوں چلتے بچے کی طرح دوڑتا چاہتی تھی جس کو اس
کی آیا تو جانے سے روکے اور بچے کی ضد بڑھتی جائے"

اب اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ بیگم نیاز اب بلیرڈ روم میں جا پہنچی
تھیں۔ سردیاں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ موسم بڑا پیارا اور دل موہ لینے والا
تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سی سانس بھر کر موسم کی لطافت کو اپنے ذہن میں سمیٹ لینا
چاہا۔ ایسی ہی تو ایک گزرتی ہوئی شام وہ بھی تھی جب اسلم سے اس کی ملاقات ہوئی
تھی۔ کلب میں لوگ اسلم سے خوش نہیں تھے۔ حالانکہ وہ بھی ایک نوعمر افسر تھا لیکن مزاج
اور اطوار کے اعتبار سے شاید وہ دوسروں سے جدا تھا۔ وہ اس محفل میں بن بلایا
ہوا سا مہمان لگتا تھا۔ بھلا یہ کوئی بات تھی کہ وہ معمولی کپڑوں میں چلا آتا اور اپنا زیادہ
وقت لائبریری میں گزارتا۔ ایک بار تو ضلع کے سب سے بڑے افسر نے اس کے لباس پر
اس سے شدید طور پر باز پرس بھی کی تھی مگر وہ یہ کہہ کر چپ ہو رہا تھا کہ
"میں کیا کروں اس ملک کی عام آبادی کا یہی تو لباس ہے"
وہ اس ضلع میں آیا تو تھا کسی انتظامی آسامی پر لیکن جلد ہی اس کو ایک دوسری
جگہ بدل دیا گیا۔ دن کے اجالے پر اس پھیلتی ہوئی رات کے سہانے پن کی طرح اسلم
بھی اس کی زندگی پر چھاتا چلا گیا لیکن جوں جوں وہ اسلم کے قریب ہوتی گئی۔ وہ اس
سے دور ہوتا چلا گیا۔ اور۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی جب اس نے اسلم سے
لائبریری روم میں کہا تھا کہ "آپ بھی عجیب ہیں، ہمیشہ یہیں بیٹھے رہتے ہیں آیئے
نا ذرا باہر چل کر بیٹھیں" اور وہ خاموشی سے باہر چلا آیا تھا۔ پھر اس
نے ان سامنے والے درختوں کے نیچے پہنچتے ہی بغیر کسی تمہید کے بات شروع کر دی

تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"مس اعجاز! میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔
میں بھی آپ کو پسند کرتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بیگم نیاز آپ
کو یہاں کیوں لاتی ہیں۔ مجھے اس کا بھی علم ہے کہ بیگم نیاز جس کی
تلاش میں ہیں وہ میں نہیں ہوں۔ وہ عزیز صاحب ہی ہو سکتے ہیں۔"

اس کے اس صاف گوئی اور اظہارِ حقیقت پر اُسے کچھ غصہ آیا تھا لیکن
اس کا انداز اس قدر معصوم تھا کہ وہ اپنے غصے کا اظہار بھی نہیں کر پائی اور وہ بولتا رہا۔

"مس اعجاز! میں اس کھوکھلی بوتل میں بند اس زندگی کا قائل نہیں جسے
اس کلب کی چار دیواری نے اور زیادہ مقید بنا رکھا ہے۔ بدلتے ہوئے زمانے کے
ساتھ جس نے ہمارے ملک کو ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ زندگی
کا میدان اس چہار دیواری سے باہر ہمارا منتظر ہے۔ یہ کس قدر افسوسناک بات
ہے کہ ہم لوگ جو ملک کی ترقی کے منصوبے بنانے اور ان کی تکمیل کرانے والے ہیں۔
عملی طور پر اس منصوبہ بندی میں شریک نہیں ہوتے۔

"یہ میرے لیے اور آپ کے لیے کتنا آسان ہے کہ شادی کر لیں
اور بچوں کی پیدائش پرورش اور بنک بیلنس کے چکر میں پڑ جائیں۔
لیکن یہ سب کچھ اس بند اور کھوکھلی بوتل کے اندر ہی ہوگا۔ زندگی
کا یہ آرام سکون اور اطمینان جو ایک دھوئیں کی مانند اس بوتل میں
چکر لگا رہا ہے۔ جس کو ہم نے کارک لگا کر روک رکھا ہے۔"

اس نے خلا میں گھورتے ہوئے اور شاید اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے
کہا تھا۔ "لیکن ایک دن یہ ہمارا سکون اور اطمینان ہی ہوگا جو اس بوتل کے کارک

کو اپنے دباؤ سے اچھال پھینکے گا اور یہ اطمینان اور سکون جس کو ہم اپنی دولت اور حق سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس بوتل کو خالی کر کے نکل جائے گا اور ہم لوگ مرتبان کی ان مچھلیوں کی طرح جس کا پانی رس رس کر ختم ہو جائے تڑپ کر رہ جائیں گے میں نہیں چاہتا کہ میں آپ اور میرے بچے اس گھٹن کا شکار ہو کر رہ جائیں میں ان میدانوں میں اطمینان اور سکون اور آسائش کی کاشت چاہتا ہوں جن کا دامن وسیع ہے جن کی پہنائیوں سے اس خوش رنگ دھوئیں کے کہیں غائب ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں میں جانتا ہوں میں نے آپ کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ آپ کے چہرے سے اندازہ لگایا ہے کہ آپ اس ماحول میں آئی نہیں لائی گئی ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے یہ آرزو صاف طور پر جھانکتی ہے کہ آپ یہاں سے نکل بھاگنا چاہتی ہیں لیکن آپ کے والدین کے خواب اور بیگم نیاز کی شفقت آپ کے لیے زنجیر بنی ہوئے ہیں۔ آپ کو مصلحتاً اس زندگی کا خوگر ہونا پڑے گا۔"

جس وقت وہ یہ سب کچھ کہہ رہا تھا فضا یکایک کتنی رومانٹک ہو گئی تھی۔ اتنی رومانٹک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے بازوؤں میں جکڑ لے۔ اپنے سینے سے لگا لے لیکن وہ بولتا رہا۔

"مس اعجاز! محبت آج بھی۔ اپنی صداقت اور صفائی کے ساتھ اسی صورت میں موجود ہے جیسی پرانی داستانوں میں ملتی ہے کہ نگاہیں چار ہوئیں اور محبت کے دیپ جل اٹھے میں گزشتہ چند ماہ کبھی آپ سے اس قدر زیادہ دیر تک اور تنہائی میں باتیں نہیں کر سکا ہوں۔ جس قدر آج کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ میں اور آپ ایک دوسرے کے بارے میں کافی سوچتے رہے ہیں۔ مگر یہ میرے مسلک اور آپ کے مستقبل کی مجبوری ہے کہ

"ہم دونوں کو الگ الگ راہوں پر ہی اپنی زندگی کا راستہ طے کرنا ہوگا۔"

وہ ماضی کے تصور کی اتنی ہی راہ طے کر پائی تھی کہ اس کے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی وہ عزیز تھا۔

"ارے مس اعجاز! آپ یہاں تنہائی میں بیٹھی کیا کر رہی ہیں۔ دیکھیے بیگم نیاز آپ کے لیے کتنی پریشان ہو رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کی تلاش کے لئے بھیجا ہے۔"

اس کو اس وقت عزیز کا آنا بڑا ہی ناگوار گزرا۔ یہ شام اس کی زندگی میں ہر سال ایک بار ہی تو آتی ہے لیکن وہ کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی عزیز سے اس کی شادی کی بات تقریباً پختہ ہو چکی تھی۔ اس سال عزیز کو ترقی کے بعد کوئی بڑا عہدہ ملنے والا تھا اور اس کے فوراً بعد ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے بنا دیئے جانے والے تھے۔ اس نے ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"چلیے ادھر ہی چلتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ یہیں بیٹھیے۔ وہ ایسی زیادہ فکر مند نہیں ہیں۔ دیکھیے کتنی اچھی فضا ہے۔ آپ کیا کچھ اداس ہیں؟"

جی ۔ جی نہیں۔" اس نے کہا اور چلنے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں میں آنسو ڈھلک آئے تھے۔ وہ تیز تیز بلیرڈ روم سے ہوتی ہوئی برج پارٹی کی طرف گئی اور اس نے بیگم نیاز سے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔

"ارے لڑکی! تجھے کیا ہو گیا ہے؟" بیگم نیاز نے اس کو دیکھ کر کہا۔ "اچھا اچھا عزیز کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"نہیں" اس نے کہا۔ "میں اپنی گاڑی میں ہی جا رہی ہوں۔ آپ کو گاڑی

واپس کر دوں گی۔"

بیگم نیاز جانتی تھیں کہ اس پر کبھی کبھی ایسے دورے پڑتے ہیں۔ وہ اس بات پر ناخوش ہوتی تھیں لیکن انہوں نے اس بات پر کھل کر کبھی اپنی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

کار میں ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے اس کو ماضی کی ایک اور شام کے کنارے لا چھوڑا۔ وہ شام جب اسلم وہاں سے جا رہا تھا اور وہ دونوں دریا کے کنارے ملے تھے۔ اسلم نے کہا تھا "تم ان کناروں کو دیکھ رہی ہو۔ جو اس دریا کے پانی کو اپنے میں لیے ہوئے ہیں۔ یہ کنارے ازل سے یونہی دراز ہیں اور ان بازوؤں کے درمیان پانی یونہی بہہ رہا ہے لیکن یہ پانی جس کو ان بازوؤں نے تھام رکھا ہے۔ اس سرزمین کو سیراب کرتا ہے۔ جس کے کنارے تہذیبوں نے جنم لیا ہے اور مٹ گئیں اور اب ان کناروں پر ایک نئی تہذیب جنم لے رہی ہے اس تہذیب میں ہم اور تم ایسے تنکے ہیں۔ جن کو اس وقت تک بہنا ہے جب تک وہ سمندر میں نہ جا گریں۔"

"میں کل جا رہا ہوں۔ میں نے اپنی راہ ان غریب، سادہ اور پریشان حال دیہاتوں میں تلاش کی ہے۔ جو ایک تہذیب کے جنم داتا بننے والے ہیں۔ کل سے میں اور آپ اس دریا کے کناروں کی طرح الگ الگ ہوں گے لیکن کیا یہ بات باعثِ مسرت نہ ہوگی کہ ہم دونوں کے بازوؤں کے درمیان محبت کا وہ دریا یونہی بہتا رہے جو ہمالہ کی پاکیزہ چوٹیوں کے برف سے جنم لیتا ہے اور بے کنار سمندر کی انتھاہ گہرائیوں میں جا شامل ہوتا ہے۔"

"اور بالآخر ایک دن ہمارے بچوں کو وہ سکون اور اطمینان کبھی نصیب ہوگا جس کو ہمارے تہذیب اور تمدن کے کھوکھلے نام لیواؤں نے کلبوں کی چار دیواری کی بوتل میں

بند کر رکھا ہے۔"

وہ آنکھیں جھکائے کہتا رہا۔

ابھی وہ یہیں تک سُن پائی تھی کہ یکایک گاڑی رُک گئی۔ بیگم نیاز کا گھر آ گیا تھا وہ کار سے کود پڑی اور اپنے کمرے میں بستر پر جا کر دھم سے گری اور اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے آہستہ آہستہ رسنے لگے۔

سرحدِ ادراک سے پرے

استادِ مکرّم لیکچر دے رہے تھے اور میں وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے وجود کے ظہور کے لیے ابھی صدیاں درکار تھیں۔ سماں نصف شب کا تھا وہ فرما رہے تھے۔

"دیکھو یہ آگ جو میرے پاس دہک رہی ہے، جسم کو گرمی بھی پہنچا رہی ہے، اور مجھے روشنی بھی فراہم کر رہی ہے جسم کو حرارت کی ضرورت ہے اور، یہ۔ یہ جو سامنے بائیں طرف ریشمی پردوں کے اندر طاق میں دھرے شمع دان میں روشنی ہے، حرارت اور آگ اس میں بھی موجود ہے، لیکن وہ جسم کو حرارت فراہم نہیں کرتی، اندھیرا چھانٹ کر صرف فکر اور قوتِ متخیلہ کو متحرک کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی حوالے سے اخذِ نور کرنے کے باوصف اپنے دائرے میں الگ الگ ہیں، مگر ان کا وجود ہے اور یہ وجود ایک نقطے سے ہی حصولِ انعکاس کرتا ہے۔"

"اچھا تم اپنی تختی پر حروف لکھو۔" استادِ مکرّم نے لیکچر روک کر ارشاد فرمایا۔

اور میں کہ جو وہاں موجود نہیں تھا اور میرے وجود کے لیے ابھی صدیاں درکار تھیں۔ تختی کو سنبھال کر قلم پکڑ کر لکھنے پر آمادہ ہوا مگر میں تختی پر ایک نقطہ ہی درج کر پایا۔ اس سے آگے کا مجھے حکمِ عمل اور درسِ تدبیر عطا نہیں ہوا تھا۔

"کیوں قلم روکے ہوئے ہو؟" استادِ مکرّم نے دریافت کیا۔ میں کہ وہاں موجود ہی

نہیں تھا، جواب کیا دیتا !

استادِ مکرم نے قریب رکھے ہوئے پیالے کو اٹھایا، جس میں پانی تھا اور میری تختی کے اس حصّے پر گرا دیا، جہاں سے میرے قلم نے آغاز کیا تھا اور وہ نقطہ مفقود ہو گیا، مٹ گیا۔ استادِ مکرّم نے فرمایا۔

" یہ نقطہ تو مٹ گیا۔ لیکن کیا واقعی مٹ گیا ؟ یا اس کے وجود نے کوئی اور شکل اختیار کرلی !" میں کیا جواب دیتا کہ جواب دینے کے اذن کے باوجود، میں ابھی جواب دینے کا مُکلّف نہیں ہوا تھا۔

استادِ مکرم نے خود جواب دیا۔ اگر میں جواب دینے کا مکلّف ہوتا تو میرا جواب بھی ایسا ہی ہوتا۔

" وقت اور زمانے کے گزرنے کی چاپ سنائی نہیں دیتی ہے، لیکن یہ چاپ ارتعاشی سماعتی عمل سے ایک محفوظ مقام حاصل کرلیتی ہے "۔

استادِ مکرّم رکے اور پھر گویا ہوئے۔ " مجھے آسان طریقے سے بات کو کہنا چاہیئے۔ ہاں ! تو جب تم نے حرف لکھنے کے لیے نقطہ لگایا، تو تمہارا قلم اسی نقطے پر رکا رہا کہ یہی نقطہ تمام حروف کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ اس کے درمیان جو کچھ ہے، وہ وقت اور زمانہ ہے۔ تم نے جو نقطہ لگایا، میں نے اپنے ایک عمل سے کہ جو عناصرِ فطرت میں سے ایک تھا، یعنی پانی اس کو اس پر ڈال کر مٹا دیا۔ لیکن وقت کی چاپ اس کے وجود کو لے کر آگے بڑھ چکی تھی، میں نے تو صرف اس کی اس ظاہری شکل کو مٹایا ہے۔ جو باطن اور وجود کی عظمت کی طرف رواں تھی اور جو باطنی طور پر اب کبھی نہ مٹنے والے ربط میں صورت پذیری کے وقت پر ثبت ہو کر وجود اور عدم کی حدود سے واصل ہو چکی ہے۔ جس نقطے کو تم نے لگایا تھا کہ دوسرے، تیسرے، چوتھے اور اسی طرح بڑھتے ہوئے وجود کے نقطوں کے تسلسل سے وہ حرف بنے۔ حروف، الفاظ اور ان کا تسلسلِ تحریر

بن جائے۔ اسی طرح وقت کی چاپ ذہن کی روشنی اور فکر کی جلا کے لیے ایک یادگار اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ ماضی کا حال پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مستقبل کا۔ اور وقت کہ جو عمودی تشکل کی رفتار میں پابہ زنجیر نہیں بلکہ دائرے کی صورت میں مقیّد ہے، لیکن جس میں ہر دائرہ ایک دوسرے سے یا تو چھوٹا ہے یا بڑا ہے۔ اپنی اسی حقیقت میں پابہ زنجیر ہے۔ یہ آگ جو جسم کو سرد ہونے سے بچا رہی ہے، وقت ہی کے ایک دائرے میں وہاں، اُس شمع دان میں موجی شمع کی شکل میں اپنی نوکِ زباں سے، ذہن میں نقش کر دیئے جانے والے وقت کے قدموں کی مدھم چاپ سے کہانیاں بُن رہی ہے۔ یہاں جسم کی حرارت اور وہاں فکر، تصوّر اور تخیل کی حرارت پہنچا کر ماضی اور مستقبل کا قرض چکا رہی ہے۔ اچھّا! اب تم اس وقت سے کہ جو ابھی تک تم کو عطا کیے جانے کے فیصلے کی رہ گزر میں ہے، ایک حقیر ترین ذرّے کے کروڑویں حصّے سے بھی کم تر کے استعمال کے مجاز کیے جاتے ہو۔ دیکھو۔ وہاں ادھر کیا ہے؟ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں" استاد مکرّم نے اپنی گفتگو ختم فرمائی۔

اب یوں ہوا کہ میں نے دیکھا۔ میں نے کہ میں جو اپنے وجود پانے کے وقت سے صدیوں پیچھے تھا۔ یہ دیکھا۔!

"تیز موسلا دھار بارش میں، سرد ہوا کے تھپیڑوں سے بے پروا، وہ دونوں ایک چھتنار درخت کے نیچے ایک دوسرے کے جسم کی گرمی سے حظ اٹھا رہے تھے۔ ان کے ذہنوں کی مومی شمع، ان کے دلوں کو روشن اور جسموں کو تپیدہ کیے ہوئے تھی، یہ ایک جوڑے کی طلبِ رفاقت تھی جو وقت کی گرفت میں محصور تھا۔"

یہ منظر وقت کی نہ سنائی دینے والی غیر محسوس چاپ کے ساتھ مدھم ہوگیا اب ایک غار کے اندرونی حصّے میں وہ کہ جو نازک اور نفیس نقوش والی تھی، درد زہ میں مبتلا تھی، لمحۂ موجود۔ ماضی سے اپنا حساب مانگ رہا تھا کہ جو، اس کو مستقبل کو ادا کرنا تھا،

ایک حرف سے کہ جو کبھی ایک لفظ بنا تھا ایک نیا سلسلۂ حروف طلوع ہو رہا تھا، جس کو لفظوں کی زنجیروں میں وقت کی تاریخ کو پرونا تھا!"

اب وقت کی چاپ کچھ زیادہ تیز ہو کر ڈوبتی چلی جانے والی چاپ کو مدھم کرتی ہوئی نئی آواز کے ساتھ ابھار رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ اب رسّیوں میں جکڑی ہوئی تھی، کچھ ہیولے اس سے زیادہ قومی، توانا اور سخت اس کو پیچھے سے دھکیل رہے تھے اور آگے والے اُسے آگے ہی آگے کھینچے لیے جا رہے تھے۔ وہ حظ، وہ لذّت کہ جو موسلا دھار بارش اور سرد ہوا کے جھکڑوں کے درمیان اس نے پائی تھی اور وہ دردِ زہ کی تکلیف اور نئے حرف کا طلوع اب کہیں نہیں تھا۔ اب تو اس کو پابہ زنجیر کرکے کچھ کے دیتے ہوئے پیچھے کی طرف سے اس کو ہانکنا اور آگے کی طرف سے اس کو اذیت ناک انداز میں کھینچنا، اس کا مقدر بن کر اس پر برس رہا تھا، وہ کہ جس نے ان ہیولوں اور نقطوں کو تراشا اور بنایا تھا اس کی عظمت سے بے بہرہ تھے۔ اور وہ راضی برضا تھی"۔

میں کہ وہ تمام جذبات رحم و کرم، لذت و تکلیف کی حسیات سے ناآشنا اور نابلد تھا، ناواقف تھا اور ابھی میرے وجود کے لیے صدیاں درکار تھیں اس منظر کو دیکھتا رہا۔

پھر یوں ہوا کہ ــــــــ

"وقت کی چاپ کی تھاپ پر نئے گیت ابھرے"۔ میں دیکھتا رہا۔ اس کی عظمت و رفعت کے اب ترانے گائے جا رہے تھے اور مخملیں گدیلوں اور کمخواب و حریر اور دیبا کے تکیوں پر وہ اپنی مرمریں کہنی ٹکائے، اپنی رعنائیوں کے سحر میں غرق اور اپنی دلربائیوں کے اعجاز میں کھوئی ہوئی، ان تمام نقطوں کو جنہیں اُس کے بطن نطق نے حیات بخشی تھی اپنے سامنے سربسجود دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی ہم جنسوں کے جھرمٹ میں ایک رشک آمیز

تحیّر کی صورت میں موثر انداز میں جلوہ آرا تھی"۔

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ میں نے دیکھا" وہ پا بہ جولاں، مقتل کی طرف لے جائی جا رہی تھی، اور اس کے بدن کے گداز میں لوہے کی زنجیروں نے گڑھے ڈال کر اسے کم تر اور بے توقیر کر دیا تھا کہیں وہ دار پر کھینچ دی گئی اور کہیں اس کو بڑے جانوروں کی کھال میں سی کر سمندر میں پھینک دیا گیا کہیں اس کا سر تن سے جُدا کر دیا گیا اور کہیں اُسے دیوار میں چنوا دیا گیا"

اب وقت کی ایک اور مدھر راگنی اونچے بلند میناروں کے درمیان ایک نئے منظر کو پیش کر رہی تھی۔ اور کہ میں جو عدم کی سرحدوں میں ہی اسیر تھا۔ یہ منظر دیکھتا رہا۔

"محلات، چوبارے، اونچی عمارتیں، قلعوں کی فصیلیں روشن تھیں، اور ہاؤ ہو کی آوازیں گونج رہی تھیں، ناقوس و قرنا پھونکے جا رہے تھے اور ان کے بیچ بیچ کبھی کبھی جب یہ بھیانک آوازیں مدھم پڑتیں تو جلترنگ سے بج اٹھتے۔ شیشے اور لوہے کے گلاس اور برتن ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، شراب تھی کہ بہہ رہی تھی، شباب تھا کہ لباس اور حیا بندی سے آزاد تھا۔ کام و دہن کی لذتیں آسودہ تھیں۔ اور ان رونقوں اور محفلوں کے بیچ میں ایک رُتق اُدھر کی بھی نظر آ رہی تھی، جہاں آڑی ترچھی بے رونق اجڑی جھونپڑیاں اور گندی نالیاں تھیں۔ بول و براز کے ڈھیر تھے، اور وہ، اپنے آس پاس کئی ننھی ننھی جانوں اور بے مصرف و مطلب نقطوں کو لیے، اس احساس سے تپ رہی تھی کہ ان سب جانوں کو پیٹ کے دوزخ کے لیے ایندھن کی ضرورت تھی، ان تمام نقطوں کو مکمل ہونے کے لیے روشنائی کی ضرورت تھی، اور وہ کہ مجبور تھی، بے بس تھی، اس کی کھال سخت اس کے نقوش کھردرے اور اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور کوئی ادھر متوجہ نہیں تھا کہ وہ ان لفظوں کی تکمیل کے لیے اپنے بدن کی حرارت سے روشنائی کے حصول کے لیے کسی کے بھی آگے ایک معمولی گدیلے کی طرح بچھ جانے کو آمادہ تھی۔!"

میں کہ بس دیکھنے کا مکلف کیا گیا تھا اور دیکھے جارہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ:
"ایک عجیب سا شور اُٹھ رہا ہے، جیسے تمام حشرات الارض کہیں سے نکل پڑے ہوں۔ اب ہر طرف آگ تھی اور دھواں تھا، اونچے اونچے شان دار، قابلِ رشک سامانوں سے مزین عظیم محلات جل رہے تھے اور لوگ اس کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے اس کو اپنا نجات دہندہ کہہ رہے تھے، اس کی عظمت و توقیر کے نعرے لگا رہے تھے اور اس کے قصیدے گا رہے تھے۔"

اور پھر میں یہ بھی دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔
"یہ کیا؟ کہ اِن اونچے محلات میں تو اُسے کوئی جگہ نہیں دی گئی وہ تو پھر اسی گندی نالی کی طرف ہانک دی گئی، جہاں سے اس کو اٹھا کر بڑے سنگھاسن پر بٹھلانے کے لیے اس کو کاندھوں پر بٹھا کر لایا گیا اور وہ بھی اب اس کو اپنی بخت باری کی زد پہ لیے ہوئے تھے کہ جن کے پیٹ کے دوزخ بھرنے کے لیے وہ اپنے جسم کی حرارت اور گداز کو معمولی کمبل کی طرح بچھا کر اُن کے لیے ایندھن تک فراہم کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔"
اور کہ میں دیکھے جا رہا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ "وہ ایک طویل ریگ زار سے گزر رہی تھی اس کے بدن کی تمام رعنائیوں کی دھنک ملیامیٹ ہو چکی تھی، اس کے خوب صورت بالوں کی لٹیں دھول خاک اور کیچڑ اور گندگی سے اَٹی ہوئی اس کے کاندھوں پر اس طرح پڑی تھیں جیسے کالے کالے ناگ سنگ مرمر کے نشیبوں سے گزر رہے ہوں، وہ برہنہ پا اور برہنہ جسم تھی، لباس لیر لیر ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے جسم کے زخموں سے خون رِس رِس کر لوگوں کے پاؤں کی رگڑ سے اچھلتی ریت کے ذروں سے کھرنڈ بن کر عجیب بھیانک شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ حسرت تھی، نہ شکایت، اس کے چہرے پر پھر نہ نفرت تھی نہ اندازِ احتجاج۔ اس کی آنکھیں نہ بے رونق تھیں اور نہ اجلی اور

چمکیلی !"۔ میں نے دیکھا۔

"یکایک ایک سمت سے بڑے بڑے کالے چینٹوں کا ایک ریلا، ابل کر اس کے آگے پیچھے جمع ہو گیا، کچھ اس کے قدموں تلے روندے جا رہے تھے اور کچھ اس کے بدن پہ چڑھ کر اس کی بھیانک زخموں تک جا پہنچے تھے، وہ بلا احتجاج، بے رضا و رغبت اس غول کی یورش سے اُن کی بنائی ہوئی راہ کی طرف گھسٹتی گئی"۔

میں نے دیکھا کہ میں اس تماشے کے لیے پابند کر دیا گیا تھا۔"وہ جھیل سے نہا کر نکلی تو اس کا کندن سا بدن ڈوبتے سورج کی شعاعوں کی رنگینیوں کو شرما رہا تھا، اس کے بالوں پر شبنمی خوشبوؤں کے قطروں سے پیدا ہونے والی نکہتوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ قوس قزح کے رنگ اس کے چہرے کی بھبن کے نکھار کے قربان ہوئے جا رہے تھے نکیلی چٹانوں کی برنائی اس کے انگ انگ کے ابھاروں اور پور پور پر نثار ہوتی جا رہی تھی اس کے سائے تلے تمام کالے پیلے، سرخ و سپید اور نیلے والے جسم ایک نئی آب اور نرالی تاب پاتے چل رہے تھے"۔

وقت کی چاپ سے پیدا ہونے والی ایسی لہروں سے کہ جن سے سمندروں کی طغیانی کے دل دہل جائیں، وہ پھر کہیں سے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔

" اب وہ سمندر کے سامنے کھڑی نمکین ہواؤں سے اپنے بال سکھا رہی تھی۔ یکایک ایک ایسی چادر نے جو ہزاروں رنگوں کے تار و پود سے بنائی گئی تھی، اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ ایک مجسمے کی صورت میں اپنی بے رونق آنکھوں کے ساتھ تیز پہیوں والے رتھوں کے پیچھے جڑے ہوئے پہیے دار لکڑی کے تختوں پر باندھ کر کھینچ کر لے جائی جا رہی تھی"۔

پھر میں نے دیکھا کہ۔

"وہ اسی سمندر کے کنارے جہاں وہ اپنے گھنیرے بال نمکین ہواؤں میں سکھا رہی تھی وہاں وہ لوہے کا ایک مجسمہ بنی کھڑی ہے سر پر لوہے کا تاج ہے اور اس کے ایک

ہاتھ میں ایک مشعل سجی ہوئی ہے"۔

اب اس کے بدن میں نہ حرارت تھی نہ گرمی، اس کے ہاتھوں میں تھمی مشعل کسی طرح منعکس روشنیوں سے تو مزیّن تھی، لیکن آنکھوں میں نہ چمک تھی نہ سرور، نہ غرور نہ نفرت اور نہ ہی امن و محبّت کی کوئی چنگاری کہ جو نہ پنہاں تھی نہ عیاں!!

اور اب میں وقت کے عطا کئے ہوئے حقیر ذرّے کے کروڑویں درجے سے کم تر وقت کے فیصلے کی حلاوت کی لذّت یابی سے روک دیا گیا تھا کہ ابھی میں وقتِ ناتمام کی رہ گزر میں تھا۔ میرے وجود کو عدم کی سرحد طے کرنے کے لیے صدیاں درکار تھیں۔

میں نے اپنے کاندھے پر استادِ مکرّم کے نامحسوس اور نادیدہ دستِ مبارک کا دباؤ محسوس کیا۔ اور سنا۔

"بس! تمھارے وجود کو ابھی ہونے کے لیے صدیوں کی مسافت طے کرنا ہے"۔

مجھے بارش کے تیز تیز قطروں کے گرنے کا احساس ہو رہا تھا جیسے بارش تو ہو رہی ہے مگر وہ بھگو نہیں رہی۔ مگر قطرے کہ وہ گرتے ہوئے محسوس بھی ہو رہے تھے اور ان کی پیاسی زمین سے ٹکرانے کی سسکاری بھی سنائی دے رہی تھی۔

استادِ مکرّم نے اپنا ہاتھ پھیلایا۔ نادیدہ اور نامحسوس! اور اُن کی شفّاف ہتھیلی پر ایک قطرہ آ گرا۔

استادِ مکرّم نے فرمایا۔" دیکھو یہ جو قطرہ میری ہتھیلی پر آ گرا ہے۔ تم اس قطرے میں ہو۔ یہ ایک قطرہ ہے کہ جو تمام دنیاؤں کو جنم دینے کے لیے بااختیار کیا گیا ہے، تمھیں اس کے ارتکاز کو اپنا مسکن بنانا ہوگا، اس میں ضم ہو کر تمھیں اپنی نفی کرنی ہوگی، یہ نفی ہی اثبات کا پتہ دے گی"۔ استادِ مکرّم فرماتے رہے۔

"یہ جو کچھ تم نے دیکھا، یہ وقت کا دائرہ تھا کہ جو کمہار کے چاک کی طرح ظرف کی تیاری کے لیے گیلی مٹّی کو لے کر گھومتا ہے، اور کبھی کبھی وقت کی تھمتی رفتار کے کسی معمولی سے

لمحے میں یہ تھوڑا سا الٹی طرف بھی ہل جاتا ہے لیکن رفتارِ وقت کہ جو اس کو گھماتی ہے وہ اس کو محسوس نہیں ہونے دیتی کہ یہی رفتار بااختیار ہے وقت اور زمانہ اس کے تابع ہے وہ زمانے اور وقت کے تابع نہیں۔"

کچھ توقف کے بعد استادِ مکرّم نے ارشاد فرمایا۔" یہ سوال شاید تم کرنا چاہو گے کہ یہ جو تم نے دیکھا کیا تھا؟ یہ وہ آرزو ہے کہ انسان کے ذہن میں اس کے فہم و ادراک میں اس کے خالق کی اس صفت کی عکاس ہے کہ خالق نے انسان کو اپنی صفات کے پرتو عطا کیے ہیں یہ زمانے اور وقت کی رفتار سے انسان کے نکل بھاگنے کی خواہش ہے، مگر وہ پابہ زنجیرِ زماں ہے۔ تم نے آزادی کی طلب کا حشر دیکھا۔! وقت اور زمانہ جس کا پابند ہے اور اسیر، اسیر بہ جبر نہیں سزا کے طور پر نہیں اس فطری دائرے میں راضی بہ رضا کہ جو اس کی آزادی کا ضامن بھی ہے۔ اور آسرا بھی!"

ایک عجیب سا زلزلہ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے قیامت آگئی ہو۔

"اوہ۔ تو امتحان کی تیاری کے لیے کتاب پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا؟"

"قسم ہے وقت کی انسان بڑے خسارے میں ہے۔" کیا مجھے بیدار ہونے میں دیر ہوگئی۔ نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ہم انسان آزادی کے مجسّمے تو بنانا جانتے ہیں، اور اپنی سرزمین کی آزادی کی یادگاروں کے نیچے ہر سال آزادی کے متعین وقت کا جشن منانے کے لیے جمع ہو کر آزادی کی قسمیں تو کھاتے ہیں، لیکن دوسروں کے حقوق کا احترام نہیں کرتے نہ وقت کی قدر کرتے ہیں، لیکن آخر کب تک؟ وہ ذہن کہ جو شعور کی بالیدگی اور ارتقا کی منزل کی طرف رواں ہے، جو عطائے وقت کے تحت تحقیق و تجسّسِ کائنات میں مصروف ہے۔ اس کو ایک دن عدم سے اپنے حقیقی اور پاکیزہ وجود میں آنا ہے۔ وہ کہ جو اسیرِ رفتارِ وقت تو ہوگا مگر اس حقیقت سے واقف بھی ہوگا اور آگاہ بھی، اور فطرت کے دائرے میں راضی بہ رضا بھی۔

اور ضامنِ آزادیٔ فکر بھی۔ کہ زمانے، وقت اور رفتار کا ساتھ دینا ہی آزادی ہے !!
انسان اگر اپنی تخلیق کی ضرورت سے واقف ہو جائے تو وہ خسارہ میں کیوں ہوگا۔
وہ تو وقت کی رفتار کے دائرے میں رہ کر خسارے کی حدود سے نکل چکا ہوگا۔ زمان و مکاں،
انسان کے لیے ہیں، انسان زمان مکاں کے لیے نہیں"۔

یہ سوچتا ہوا، میں بہرحال اٹھا اور اُٹھ کر تیار ہوا اور مقابلے کے امتحان کے آخری
مرحلے یعنی بورڈ کے اعلا حکام کے سامنے انٹرویو کے لیے چل پڑا۔ نقطۂ بیاں کی زبانی
آزمائش سے گزرنے کے لیے، سرخرو ہونے کے لیے !! میں روانہ ہوا تو وقت میرے قدموں
کے بھی پیچھے تھا اور میں وقت کی ہی طرف رواں دواں بھی تھا کہ وقت دائرے کی رفتار
میں کسی نقطے کے آغاز میں قید نہیں۔ تو گویا۔ یہ زماں ہے اور وہ مکاں کہ جہاں مجھے
پہنچنا ہے۔ !!

(۱۹۶۵)

نادر علی

حیدرآباد سندھ کے نزدیک ذہنی اور نفسیاتی بیماروں کے لیے ایک قدیم ہسپتال ہے۔ جس کو عام طور پر گدو کا پاگل خانہ کہا جاتا ہے۔

اس ہسپتال سے متعلق کچھ دنوں سے اخبارات میں اس کے خراب انتظام وانصرام اور مریضوں کے ساتھ عملے کے ناروا سلوک، انتظامیہ کی لاپرواہی، مریضوں کے لیے مجوزہ غذا کے نہ ملنے، ان پر زیادتیوں کے ہوتے اور فنڈز میں خرد برد کی خبریں آرہی تھیں۔ جس کی حکام کی طرف سے تردید بھی کی گئی۔ تاہم نکتہ چینیوں اور خیال آرائیوں کا سلسلہ جاری رہا تو محکمۂ اطلاعات نے صحافیوں کو پاگل خانہ دکھانے کا انتظام کیا۔ صحافیوں کی اس جماعت میں مجھے بھی شامل کیا گیا تھا۔ جب ہم لوگ پاگل خانے کا بڑا گیٹ عبور کر کے جو بند رہا کرتا ہے اندر پہنچے تو بہت بڑا کشادہ اور وسیع وعریض رقبہ سامنے پھیلا ہوا تھا جس میں بڑے بڑے سایہ دار درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور چھوٹے چھوٹے پودوں پر پھول بھی لہلہا رہے تھے۔ تاہم اس کے بیچ میں کھڑی ہوئی دو منزلہ عمارت جو کئی بلاکوں پر پھیلی ہوئی عجیب ہیبت ناک نظر آئی، گویا اس عمارت کا باہر کی دنیا سے کوئی رابطہ ہی نہ ہو۔

جب ہم عمارت کے اندر گئے تو انتظامیہ سے متعلق مخصوص بلاک نہایت صاف

ستھرا، شفاف اور سلیقے سے سجا ہوا نظر آیا۔ لیکن اندر تمام برآمدوں اور ان سے متعلق کمروں سے ایک مخصوص بدبو اور سیلن اُبل رہی تھی، بلکہ اس کو زیادہ بہتر طور پر سڑاند کہا جا سکتا تھا۔ کمروں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر سلاخیں اور موٹی جالیاں لگی ہوئی تھیں جن پر مدتوں سے رنگ روغن نہیں کیا گیا تھا سب کچھ زنگ آلود اور غلیظ نظر آ رہا تھا۔

جب ہم کو نہایت صاف شفاف اور خوب صورت پھولوں سے سجے ہوئے بلاک میں بٹھلا کر انتظامیہ کے مہتمم نے بریف کر دیا اور متعلقہ سوالات کے جواب دے دیے اور صحافیوں کے چبھتے ہوئے سوالوں کے تمام نشتر ہنس ہنس کر انتظامیہ کے سربراہ نے جھیل لیے تو ہم کو مریضوں کے بلاک کی طرف لے جایا گیا۔ اُٹھنے والی بدبو کی وجہ سے بعض ساتھیوں نے ناک پر رومال رکھ لیے۔ ہمارے بعض ساتھی ان پاگلوں کو جو کہیں بڑے اور چھوٹے کمروں میں گروہ کی شکل میں یا محض تنہا بند تھے بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ واقعی ان کی حالت نہایت خستہ اور خراب تھی اور بعض کی حالت تو واقعی جانوروں سے بھی بدتر دکھلائی دیتی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایسا ہی سب کچھ تو اس چہار دیواری کے باہر بھی ہے، یہی سڑاند، یہی سیلن، یہی گھٹن اور یہی قید و بند اور پابندی!

اسی دوران ایک کمرے میں مجھے ایک نہایت تن درست و توانا، سُرخ و سپید رنگ کا چہرہ نظر آیا۔ میرے دل کے کسی گوشے سے ایک احساس نے جنم لیا کہ میں نے شاید اس کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، وہ نسبتاً صاف سے کپڑے پہنے تھا اور سلیقے سے پہنے ہوئے تھا۔ داڑھی اس کی کوئی ہفتہ بھر سے صاف نہیں کرائی گئی تھی، اس کے بال گھونگھریالے مگر میلے اور الجھے تھے۔ میں نے دروازے کی سلاخوں کے ذرا قریب جا کر اسے دیکھا وہ بھی سکون سے مجھے دیکھتا رہا اور ایک نہ محسوس ہونے والی مسکراہٹ سی اس کے ہونٹوں پر آ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کچھ دیر بعد ایک چمک سی پیدا ہوئی وہ ایک قدم دروازے کی سلاخوں کے قریب آیا کہ پاگل خانے کے ایک جونیئر منتظم

نے جو مجھے آگے بڑھ کر دروازے کی سلاخوں کو پکڑتے ہوئے دیکھا تو وہ میری طرف تیزی سے لپکا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "یہ ایک اچھا اور شریف مریض ہے لیکن کبھی کبھی اس پر نہایت ہی خطرناک قسم کا دورہ پڑتا ہے۔"

"اچھا کیا نام ہے اس کا؟ میں نے پوچھا

اس نے جواب دیا "نادر علی"

"نادر علی؟ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "نادر علی!"

صمد استاد کے ہوٹل میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہاں ٹائیلٹ کا مناسب انتظام نہیں تھا تاہم انہوں نے ہوٹل کے باورچی خانے کے پیچھے ایک گندی سی جگہ ایسا انتظام کر رکھا تھا۔ اور ایک روز مجھے مجبوراً ادھر ہی جانا پڑا۔ جب میں باورچی خانے کے پاس نل کے نیچے گندے برتنوں کو پھلانگ کر ٹائیلٹ کی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا تو مجھے وہ برتن مانجھتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھوں کی جلد ہی کالی نہیں ہو رہی تھی بلکہ اس کا تمام جسم کالا ہو رہا تھا، اور وہ نہایت انہماک سے گندے برتن مانجھ رہا تھا لیکن وہ ایک طرح دار نوجوان تھا۔ اس کے سر کے بالوں کی جڑوں کے نزدیک پیشانی کی جلد بڑی سفید اور شفاف نظر آ رہی تھی، چہرہ تمام کالک سے لپا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور برتن ایک طرف کھسکا کر میرے لیے اس نے راستہ بنا دیا اور میں آگے بڑھ گیا۔

پھر ایک دن جبکہ میں صمد استاد کے پاس کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے سگریٹ پیتے ہوئے ان سے باتیں بھی کر رہا تھا اور اپنے دوستوں کی آمد کا انتظار بھی۔

صمد استاد نے کاؤنٹر کے بالکل سامنے یعنی اپنی آنکھوں کے یا جو بھی کاؤنٹر پر بیٹھے اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بہت بڑی سی تصویر لگا رکھی تھی جس میں ایک خوبصورت صحت مند توانا سا بچہ کِلکاریاں مارتے دکھلایا گیا تھا، اور بس۔ اس سامنے کی دیوار

پر کوئی اور تصویر نہ تھی، لیکن ہوٹل کے ہال کی دیواروں پر جس کے نیچے بچھی ہوئی بینچوں یا کرسیوں پر گاہک بیٹھا کرتے تھے۔ قدیم عہد کے مصوروں کی تصاویر کے رنگین فوٹو بڑے بڑے فریموں میں لگے ہوئے قطار در قطار آویزاں تھے۔ ان تصاویر میں سے مجھے ایک تصویر بہت پسند تھی جس میں ایک خوب صورت عورت کو اس طرح دکھلایا گیا تھا کہ اس کے چہرے سے زیادہ اس کی چھاتیوں کی ساخت نمایاں تھی اور عورت کی گود میں بیٹھا بچہ اپنا منہ بڑھا کر اس کی چھاتیوں کی طرف ہمک رہا تھا۔

میں اس وقت ایک طرف ذرا جھکا ہوا، اسی تصویر کی طرف جھانک رہا تھا کہ ایک نہایت تن درست توانا سرخ و سپید رنگت اور شہابی چہرے پر گھونگھریالے بال سجائے بلند و بالا پیشانی والا سفید کلف لگے کپڑوں میں ملبوس اور خوشبوئیں لبسا ہوا، ایک نوجوان صمد استاد کی طرف بڑھا اور صمد استاد نے اس سے پوچھا۔

"کہو نادر علی تیار ہو گئے؟"

"جی۔" نوجوان نے نہایت شرمیلی سی آواز میں جواب دیا اور صمد استاد نے کاؤنٹر کے نیچے بنی ہوئی دراز کھینچ کر پانچ روپے نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنی جیب سے بھی سوا روپیہ اس میں ملاتے ہوئے کہا۔

"نادر علی یہ سوا روپیہ میری طرف سے بھی نیاز کا چڑھا دینا۔"

"جی بہت اچھا۔" اس نے رقم لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اور ہاں دیکھو۔ نادر علی میرے لیے آج بھی دعا کرنا کہ خداوند قدوس بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل ان کی سفارش اور صدقے میں مجھے میرے گھر میں ایک چاند سا بیٹا۔ ایسا جیسا اس تصویر میں ہے، اب تو عطا کر دے ممکن ہے نادر علی خدا تمہاری دعا سن لے۔" صمد استاد نے کاؤنٹر کے سامنے لگی ہوئی بچے کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ وہی نوجوان تھا جو اس دن برتن مانجھ رہا تھا اور

نہایت درجہ کالک اس کے چہرے گردن، بدن ہاتھوں اور پاؤں میں لگی ہوئی تھی اور نہایت چیکٹ گندے اور بدبودار کپڑے پہنے ہوئے تھا اور آج یہ کتنا بدلا ہوا نظر آرہا تھا، نہایت طرح دار اور شان دار!

صمد استاد سے پتہ چلا کہ وہ ہر جمعرات کو چھٹّی کرتا ہے، نہاتا، دھوتا ہے صاف شفّاف کپڑے پہنتا ہے اور شام کو عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر پھول چڑھانے جاتا ہے۔

صمد استاد کی شادی کو گیارہ سال ہو چکے تھے اور وہ اولاد کو ترس رہے تھے انہوں نے بیوی کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی کوئی مزار، مقبرہ، پیر فقیر اور تعویذ گنڈا انہیں چھوڑا تھا لیکن ان کی بیوی کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔

ایک دن شام کو میں نہایت تھکا ہوا تھا اور دوستوں کی محفل سے زیادہ کسی پُرسکون جگہ کچھ دیر تنہا بیٹھ کر سوچنا چاہتا تھا۔ چناں چہ میں اس شام کلفٹن جا پہنچا۔ وہ جمعرات ہی کی شام تھی، میں ایک تنہا مقام دیکھ کر سگریٹ سلگا کر اپنی سوچوں میں گم ہو گیا سامنے سمندر تھا اور اس کے میرے درمیان ایک ریتلا میدان حائل تھا۔

آج پریس کلب میں بعض ساتھی اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ ہم میں سے کتنے ساتھی ایسے ہیں جو مجرد زندگی گزار رہے ہیں اور گھر بسانے کے ایسے خواب دیکھتے ہیں جن کے عملی شکل اختیار کر کے ہماری گرفت میں آنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں ہے بھوک کو جو پیٹ کی ہے کسی نہ کسی طرح بجھا لیتے ہیں لیکن جسم کے بھی کچھ تقاضے ہیں اس کی بھی کچھ طلب ہے وہ بھی اپنی بھوک مٹانا چاہتا ہے ہم لوگوں کے نزدیک شادی بڑا اُلجھا ہوا مسئلہ ہے۔ گھر کہاں سے لائیں، گرہستی کے سامان کہاں سے فراہم ہوں؟ اور پھر ہمارے اونچے خواب جو ہم زمین سے عرش کی طرف منہ اُٹھا کر دیکھتے ہیں کیسے پورے ہوں گے؟ ہمارے مالکان اپنی ضرورت کے لیے خوش اسلوبی اور عجلت سے کام نمٹانے کے لیے موٹر سائیکل کے

لیے تو فرصت دے دیتے ہیں لیکن شادی کے لیے اور گھر بسانے کے لیے وہ ہم کو تنہا خوابوں کے اس سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جہاں تنکے کا بھی کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ مقابل جنس کے خوب صورت اور نازک اندام ہیولے۔ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول تو کرا لیتے ہیں لیکن ان کو چھونے اور حاصل کرنے کے لیے ہم طبقاتی سوسائٹی سے تشکیل ہونے والے پشتوں کو عبور کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ کتنے حسین خواب ہم لوگ روز دیکھتے ہیں ریت کے گھروندے بناتے ہیں جو ہاتھ میں نہ آسکنے والی ہوا، توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور ہم لوگ رو کیسی کیسی نازنین شہزادیاں۔ کشورِ دل ہی میں گھٹ کر رہ گئیں گنگناتے رہ جاتے ہیں، ہم جن لڑکیوں کو اپنانا چاہتے ہیں جن کے ساتھ ہم گھر بسانا چاہتے ہیں جن کے ملاپ سے ہم خوب صورت بچے پیدا کر کے اپنی موت کے خلا کو پُر کرنا چاہتے ہیں وہ ان اعلیٰ افسروں کے گھروں میں اپنے آپ کو سجا لیتی ہیں جن کے نہ چہرے شاداب ہوتے ہیں اور نہ جن کے جذبات تنومند اور سرشاریِ احساس سے آتش بجاں ہوتے ہیں، اور پھر ہم ان حسین لڑکیوں کے خوابوں کو اپنے نہاں خانوں کے "مینٹل پیس" پر سجا کر کسی اور کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دینی اور مذہبی اخبار نویس دوست کا کہنا تھا کہ ایسے خوابوں اور خیالات کی یلغار سے بچنے کے لیے کثرت سے عبادت کرنا اور روزے رکھنا ایک بہترین حل ہے لیکن جسم کے تقاضے پورے کرنا ایک صحت مند اقدام ہے لیکن بلاشبہ ایسے طریقوں سے کہ معاشرے میں رخنہ اندازی نہ ہو کسی کا کہنا تھا کہ ہمارا مذہب ہم کو راہبانہ زندگی گزارنے کی تعلیم نہیں دیتا، دین کی تکمیل دنیا کے قلب میں اتر کر ہی ممکن ہے۔

میں یہ باتیں سوچ رہا تھا کہ سامنے سے نادر علی آتا ہوا نظر آیا۔ آج اس کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی شہابی کیفیت تھی سفید براق کپڑوں میں وہ کچھ زیادہ ہی بج رہا تھا اس کے گھونگھریالے بالوں کی ایک لٹ اس کی فراخ اور شفاف پیشانی پر پڑی ہوئی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے نزدیک آنے پر اس سے پوچھا "آؤ نادر علی

کہاں سے آرہے ہو۔" جب وہ میرے قریب آیا تو میں نے غور کیا وہ نہایت نفیس اور قیمتی کپڑے کا کڑھا ہوا کرتا پہنے تھا اور کپڑوں سے کسی تیز عطر کی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نہایت خوبصورت ٹرانزسٹر بھی تھا۔ اس نے جواب دیا "مزار شریف سے ہو کر آرہا ہوں دعا کرنے گیا تھا۔"

"کیا دعا کرنے گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔ وہ میرے قریب ہی ریت پر بیٹھ گیا۔ سامنے سے چند خوبصورت، خوش اندام اور چنچل لڑکیاں اچھلتی کودتی اور ایک دوسرے سے چہلیں کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ جواب دینے کے بجائے نادر علی انہیں غور سے دیکھنے لگا اس کی بھوکی نظروں کے جال اُن کو آنکھوں کی پتلیوں کی روشنی میں اس طرح گرفتار کر لینا چاہتے تھے جیسے مچھیروں کا جال پانی میں اچھلتی کودتی مچھلیوں کو کھینچ لیتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت دل فریب اور سہانی سی مسکراہٹ چپک کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس سے پھر پوچھا۔ "نادر علی کیا دعا کرنے گئے تھے؟" اس نے گھبرا کر سامنے سے نگاہیں ہٹائیں اور بڑی شرمیلی اور معذرت آمیز مسکراہٹ کو پھر سے تابندگی سے سجانے کے لیے اپنے ہونٹوں پر جسم کی طلب میں آ بیٹھنے والی پچھلی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"بس بابوجی۔ کیا دعا کرنی تھی، ایک ہی دعا ہے اپنی تو۔ اللہ گھر بسا دے۔"

"اچھا!" میں نے مسکرا کر اس طرح اس کا ہاتھ دبایا جیسے کوئی طویل منزل کا مسافر اپنے ساتھ سفر کے لیے مل جانے والے دوسرے مسافر کو پا کر اس کا استقبال کرتا ہے۔

"ہاں جی۔ میں اپنی سب تنخواہ صمد استاد کے پاس جمع کرا دیتا ہوں، اس لیے جی۔ کہ اپنے قبیلے میں جا کر دلہن خرید لاؤں۔"

"دلہن خرید لاؤ!؟" میں نے استعجاب سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "ادھر ہمارے قبیلے میں دلہن کے باپ کو بھیڑ

بکریاں یا پھر روپیہ دینا پڑتا ہے جب کہیں جا کر نکاح ہوتا ہے۔"

"تم اپنی بیوی کو یہاں لاکر کہاں رکھو گے تمہارے پاس کوئی ٹھکانا ہے؟"

میں نے اس سے دریافت کیا۔

"نہیں جی ابھی تو نہیں ہے لیکن کہیں نہ کہیں جھونپڑی ڈالنی پڑے گی۔" وہ ذرا کی ذرا رکا اور پھر بولا۔

"جب میں ادھر نہیں آیا تھا جی اور کوئی یہاں آکر کام کرنے والا ہمارے اُدھر جا کر یہاں کی باتیں سُناتا تو ایسا لگتا تھا کہ بس جنتّ ادھر ہی ہے، لیکن اب۔۔" وہ پھر رک گیا۔

"لیکن کیا؟" میں نے اس سے پوچھا

"بس جی کیا ہے یہاں تو زندگی عذاب ہے چلتے پھرتے سینما دیکھتے جاؤ۔ ہم سے باہر، ہماری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہے وہ سب سینما میں چلتی ہوئی فلم ہی تو ہے، جس کو دیکھا تو جاسکتا ہے لیکن اس کو ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا اس کے اندر خود رچا بسا نہیں جاسکتا۔"

"واہ وا، نادر علی تم نے کیا شاندار بات کہی ہے۔"

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا، مجھے ایسا محسوس ہوا گویا جو کچھ میرے دل میں، دماغ میں تھا وہ نادر علی کے لفظوں میں ڈھل کر نکل رہا ہے میں اپنے آپ کو یکایک ہلکا، بشاش اور مسرور سا محسوس کرنے لگا تھا۔

سامنے بچوّں کے پارک میں بچےّ کھیل رہے تھے۔ چھوٹے بڑے ننھے منےّ بچےّ! کوئی جھولے پر جھول رہا تھا کوئی محض بیٹھا ہوا چہک رہا تھا۔ مجھے بچے بہت پسند ہیں میں انہیں بڑے غور سے دیکھنے لگا کتنی پیاری ہو جاتی ہے دنیا ان کے وجود سے پاک صاف معتبر، متبرّک، نفیس اور پاکیزہ۔ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے دل میں دعا کی، اللہ تو ان کو ہماری عمر تک پہنچنے پر اچھا زمانہ دینا۔ ہماری نسل کی سب برائیوں خرابیوں اور

ہاتھ نہ آسکنے والی تمام آلودہ خواہشوں، بے باک اونچ نیچ اور طبقاتی رسّہ کشی سے مبّرا معاشرہ عطا کرنا، ہماری آج کی الجھنوں اور منافرتوں سے پاک اور آزاد دنیا ؟"

میں نے یکایک نادر علی سے پوچھا، جو خود بھی بچّوں کو اچھلتا کودتا دیکھ کر مسکرا رہا تھا، "نادر علی تمھیں بچّے پسند ہیں ؟"

"ہاں جی ۔" اس نے بڑی دل نوازی سے جواب دیا ۔" بچّوں ہی سے تو دنیا کی رونق ہے انہیں دیکھ کر، انہیں پیار کر کے انھیں چھو کر گود میں لے کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جنّت کی ہوا آرہی ہو ۔ اور جی پھر یہ بچّے ہی تو ہیں جن سے دنیا کو آباد رہنا ہے ۔"

ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ ہی نادر علی کے کپڑوں میں تیز عطر کی بسی ہوئی خوشبو میرے نتھنوں میں آگھسی ۔ میں نے نادر علی کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا ۔

"نادر علی یہ تو بتاؤ، یہ تمھارے اتنے قیمتی کپڑے یہ ٹرانزسسٹر، یہ خوشبو، یہ خوب صورت جوتے اور یہ شوخ رنگ کا رومال یہ سب کچھ کیا ہے ؟"

"ارے وہ یہ ہے جی کہ ۔" نادر علی نے جواب دیا ۔" مجھے صمد استاد نے اپنے گھر کی دیکھ بھال اور کام کاج کے لیے اپنی کوٹھی پر بھیج دیا ہے ۔ ان کی ماں اور بہن لاہور گئی ہوئی ہیں ۔ بی بی جی صمد استاد کی بیوی ! مجھ پر بڑی مہربان ہیں ۔ یہ سب کچھ انہوں نے ہی دیا ہے ۔ کپڑے بھی عطر بھی کنگھا بھی اور تیل، بہترین صابن اور یہ ٹرانزسسٹر اور ۔ اور بہت کچھ" ۔ "ہاں جی بہت کچھ ۔ "

"اچھا !" میں نے آنکھوں میں شوخی پیدا کرتے ہوئے اسے چھیڑنے کے لیے کہا نادر علی نے میری آنکھوں میں جھانکا اور پھر یکایک نظریں چراتے لگا ۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی اور اس کی سانس بھی تیز تیز چلنے لگی ۔ یکایک کچھ دیر تھم کر نادر علی نے گردن اٹھا کر میری طرف اس طرح دیکھتے ہوئے کہا جیسے کوئی اعتراف کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر کے اطمینان حاصل کر چکا ہو، اور کسی نہ کسی طرح اس بوجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا ہو کہا ۔

" جی ۔ اب تو میں گناہ گار ہو چکا ہوں ۔ اللہ جانے اس کی اب مجھے کیا سزا ملے گی ۔" اتنا کہتے ہوئے وہ نڈھال سا ہو گیا اور پھر دھیمے لہجے میں بولا ۔" میں سنگ سار کر دیا جاؤں گا جی ۔ مجھے ایسی ہی سزا ملنی چاہیئے ۔" یہ کہتے ہوئے نادر علی پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی ۔

" ہاں ۔ بہ شرطے کہ صمد استاد کو معلوم نہ ہو !!" میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ۔

" اسی لیے تو اب میں جلدی سے گھر جا کر اپنی شادی کر لینا چاہتا ہوں جی ۔" وہ بولا ۔

اس کے بعد ایک طویل عرصہ گزر گیا ، میں نے نادر علی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی احتیاطاً میں نے اس کے بارے میں صمد استاد سے کچھ معلوم کیا ۔

کوئی دس بارہ مہینے کے بعد جب میں یہ عرصہ اپنے اخبار کی طرف سے باہر بھیجے جانے کی صورت میں گزار کر واپس آیا ، اور جب ایک دن جب صمد استاد کے ہوٹل پہنچا تو ہوٹل بڑا سجا ہوا تھا خوب رونق نظر آ رہی تھی مگر اس وقت صمد استاد ہوٹل میں نہیں تھے ، وہاں معلوم ہوا کہ اللہ نے صمد استاد کی دعا سن لی ہے اور وہ ایک عدد بچے کے باپ بن گئے ہیں اور ایک ہفتے سے جشن منایا جا رہا ہے ۔ مٹھائیاں تقسیم ہو رہی ہیں ، غریبوں کو کھانے کھلائے جا رہے ہیں کپڑے تقسیم ہو رہے ہیں اور مستقل گاہکوں کو بھی مفت کھانے اور مشروبات دعوت کے کھانے کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں ۔

میں ابھی چائے پینے کے بعد سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور صمد استاد سے لے کر نادر علی تک قائم ہونے والے تعلق کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ صمد استاد آ گئے اور کاؤنٹر کی طرف مڑتے ہوئے ان کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ ایک فلک شگاف نعرہ لگاتے ہوئے

میری طرف بڑھے اور میرے کھڑے ہو جانے پر انھوں نے مجھے اپنی باہوں میں دبوچ لیا۔ وہ بہت مسرور نظر آ رہے تھے اور آسودہ طبیعت بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "ارے آپ کی تواضع کی گئی کہ نہیں؟" انہوں نے ایک بیرے کو بلایا۔ میں نے کہا۔

"استاد میں تو چائے وغیرہ سب کچھ کھا پی چکا ہوں، اب تو صرف آپ کو مبارکباد دینے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔" انہوں نے پھر مجھے اپنی باہوں میں بھر لیا اور گھسیٹ کر مجھے کاؤنٹر کی طرف لے گئے اور اس کے نیچے کی دراز سے بڑھیا مٹھائی کا ایک ڈبہ نکال کر میرے سامنے کھول کر رکھ دیا اور تحکمانہ انداز میں بولے۔" لو کھاؤ!" "لیکن میں تو ——"

"نہیں۔ یوں نہیں ہوگا۔" انھوں نے تیزی سے کہا اور ڈبے میں سے ایک رس گلہ اٹھا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہوٹل کے ایک کونے میں لگی ہوئی اس تصویر کے بچے کی ننھی منی سی مٹھی میرے ہونٹوں پر آ چکی ہو جو میری پسندیدہ تصویر میں اپنی ماں کی گود میں لیٹا اس کی ننگی چھاتی کی طرف ہمک رہا ہے۔ ننھے منے بچے کی مخصوص خوشبو۔ ایسی خوشبو، جو دنیا کی تمام بہترین خوشبوؤں کا نچوڑ کہی جا سکتی ہے، میرے نتھنوں سے ہوتی ہوئی میرے مشامِ جاں تک اترتی چلی گئی۔ میں نے ہونٹ وا کیے اور اس رس گلے کا آدھا حصہ منہ میں رکھ لیا۔ میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔" کاش کہیں میرا بچہ ہوتا۔ میں اس کا ننھا منا ہاتھ اس کی مٹھی چوم سکتا اس کی پیشانی اس کے رخسار اس کے ہونٹ!" میں نے یکایک رس گلے کا منہ میں رکھا ہوا حصہ نگلتے ہوئے صمد استاد سے پوچھا۔" وہ — وہ نادر علی کہاں ہے؟ وہ جو مزار پر جا کر آپ کے صاحبِ اولاد ہو جانے کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔"

استاد نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نصف رس گلے کے ٹکڑے کو بھی میرے منہ میں ٹھونستے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔

"وہ نادر علی۔ وہ اپنی شادی کرانے اپنے وطن گیا ہوا ہے۔"

"اچھا!" میں نے بہ مشکل رنج گلہ چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اُسے شادی کا بڑا شوق چرایا تھا کل ہی تو گیا ہے وہ۔ اس کو میرا بچہ بہت پسند آیا تھا، جب میں نے بچہ ہسپتال میں دیکھا تو وہ میرے ساتھ ہی تھا، پہلے تو وہ بچے کو دیکھ کر رونے لگا اور پھر اُسے بہت پیار کیا، اُسے بچہ بہت پسند آیا تھا۔ پھر وہ اس کے دوسرے دن سے ہی جانے کی ضد کرنے لگا اور چلا گیا۔"

صمد استاد سے اس ملاقات کے چند روز بعد ہی مجھے اخبار کی طرف سے مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا اور پھر مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد میں بھارت میں قید رہا اور جب وہاں سے تباہ حال اور خستہ صورت واپس ہوا تو ایک دن جب چند ضروری کاغذات کی تکمیل کے لیے میں سٹی کورٹ اپنے ایک صحافی دوست کے ساتھ گیا ہوا تھا تو سٹی کورٹ کے صحن کے ایک کونے میں، میں نے ایک مجمع لگا ہوا دیکھا جہاں سے کسی کی تیز جگرپھاڑ چیخوں کی آواز آ رہی تھی۔

"ہاں۔ ہاں مارو مجھے۔ مارو مجھے مارو۔ مجھے سنگ سار کرو۔ سب کچھ جو تمہارا جی چاہے کرو، میری بوٹی بوٹی نوچ ڈالو۔ لیکن مجھے میرا بچہ دلا دو، وہ میرا بچہ ہے میرا خون ہے۔ میرا پاک خون، میرے بدن کا اپنا خون مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا گیا ہے۔ مجھے لوٹ لیا گیا ہے، مجھے میرے اپنوں سے محروم کر دیا گیا۔ اور اب کیا رہا ہے میرے پاس۔ ہاں ہاں مجھے سنگ سار کرو۔ مجھے سنگ سار کرو۔"

میں اس ہنگامے کو سن کر ادھر بڑھا۔ میرے دوست نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو یار چھوڑو اسے وہ تو وہی نادر علی ہے، صمد استاد کے بچے کو جو اپنا بچہ پکارتا پھرتا تھا۔ پاگل ہو گیا ہے پولیس اسے پاگل خانہ بھجوانے کے لیے عدالت کے سامنے پیش کرنے کو لائی ہوگی۔"

"کیوں؟ کیوں ایسا کیوں ہوگیا؟" میں نے گھبراہٹ اور عجلت میں اپنے صحافی دوست سے پوچھا جو روزانہ کرائم رپورٹنگ کے لیے عدالت کے بھی چکر لگایا کرتے تھے۔ "تمھیں نہیں معلوم؟" انھوں نے مجھ سے پوچھنا چاہا، میں اس کو جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا، میں نے مجمع کے درمیان گھس کر دیکھا۔

وہ خوب صورت، شہابی چہرے آفتابی پیشانی اور مہتابی روشنی والی آنکھوں کا نادر علی، پھٹے پرانے کپڑے پہنے میل کچیل سے اٹا، زخموں سے چور چور۔ رسیوں اور ہتھکڑیوں میں بندھا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی فریاد اور رحم طلبی تھی۔ پہچان کی قوت آنکھوں سے مفقود ہو چکی تھی۔ ہونٹوں سے الفاظ کی لہروں، جملوں کے دریا بن بن کر بہے جا رہے تھیں۔ یکایک وہ فرش پر گر پڑا، اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں بازو جکڑے ہوئے تھے ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کے بل تھے پاؤں اور کمر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے فرش پہ زور زور سے سر مارنا شروع کر دیا۔ سرخ سرخ خون سے تمام فرش رنگین ہوگیا۔ میں پیچھے ہٹ آیا۔

بعد میں میرے دوست نے بتایا کہ نادر علی وطن سے اپنی بیوی کو لے آیا تھا اور یہاں ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ اس نے صمد استاد کے ہوٹل کی نوکری چھوڑ دی تھی محنت مزدوری کرتا تھا۔ بچے کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی بیوی یہاں کے موسم گھٹن اور خراب حالات کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے اپنی تمام صحت مندی سے محروم ہو چکی تھی اور بچے کی پیدائش کے وقت مر گئی، پھر بچے کو لیے ہوئے نادر علی گھومتا رہتا تھا۔ چند روز بعد ہی وہ بچہ بھی مر گیا، لیکن نادر علی اس کی لاش کو لیے گھومتا رہا تھا، بڑی مشکل سے لوگوں نے اس سے چھین کر دفن کیا۔ تب سے ہی یہ پاگل ہے۔ ایک روز یہ صمد استاد کے ہوٹل میں گھس گیا استاد کو پکڑ لیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ اس کا بچہ اس کو دیا جائے اُن کا بچہ اس کا بچہ ہے۔ بڑا ہنگامہ ہوا۔ اس نے ہوٹل کا سامان بھی توڑ پھوڑ دیا اور پھر اس

کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔

—— تو یہ تھا۔ نادر علی ۔!

لیکن اس وقت پاگل خانے کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے ہوئے اور اس روز سٹی کورٹ کے احاطے میں دیکھے جانے والے نادر علی میں بڑا فرق تھا۔

اس وقت وہ ملیشیا کے کپڑے کی قمیض شلوار میں ملبوس تھا۔ اس کی آنکھوں میں مہتابی چمک نہیں تھی لیکن وحشت بھی نہیں تھی بس ایک نامانوس سی ویرانی تھی۔

یکایک میرے کانوں سے اس کی آواز ٹکرائی۔

" بابو جی۔ مجھے یہاں ہفتے میں ایک بار سنگ سار کیا جاتا ہے، میرے سر پر بجلی کی لہروں سے پتھر برسائے جاتے ہیں۔ یہ مجھے اچھا کرنا چاہتے ہیں، میں اچھا ہو کر یہاں سے باہر نہیں جانا چاہتا۔ وہاں ادھر آپ کی دنیا میں بچے ہوں گے یہاں نہیں ہیں۔ میں بچوں کو چلتے پھرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ تو میرے خیالوں میں بسے ہوئے ہیں میں نے اُن کے سینما کو، چلتے پھرتے سینما کو اب اپنے دل میں بسا لیا۔ میں اب خود اس کا ایک حصہ ہوں، میں سینما کی اس دنیا کو چھو کے دیکھتا ہوں، اب میں اس میں خود رچ بس گیا ہوں، میں اب خود۔ اس سے باہر کیسے آسکتا ہوں۔"

نادر علی بولتا رہا اور میں آنسو ضبط کیے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

" اب جی۔ میں کسی سے نہیں کہتا کہ وہ میرا خون ہے، وہ جو کہیں ایک عورت کی گود میں پل رہا ہے، آپ بھی مت کہنا اس سے! اس کا پردہ رکھنا، اس لیے بابو جی کہ وہ میرے پاک خون کی امین ہے، وہ تو جی اب حشر کے دن بھی اسی کے نام سے پکارا جائے گا۔ جب خدا کو پردہ رکھنا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں پردہ اٹھانے والے۔"

یکایک نادر علی کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے اور وہ چیخنے لگا۔

"خدا اس کو بھی سنگ سار کرے گا، وہ جو، اب بچے کی ماں بنی پھرتی ہے

لیکن جوں جوں وہ بچہ بڑا ہوتا رہے گا، وہ اندر ہی اندر سنگ سار ہوتی رہے گی۔
لیکن نہیں، نہیں میرے خدا وہ تو میرے خون کی امین ہے، وہ تو میرے بچے کی ماں ہے۔ اے اللہ تو اسے سنگ سار نہ کر یا وہ تو چیخ بھی نہیں سکتی، میں تو پاگل ہوں چیخ سکتا ہوں، سنگ سار کیا جا سکتا ہوں۔ اے اللہ تو اسے معاف کر دے۔ اس کے بدلے مجھے دگنی سزا دے لے۔ مجھے سنگ سار کرو، اسے کچھ نہ کہو، ورنہ بچہ تڑپے گا، میرا بچہ رو دے گا، پریشان ہوگا اس کو کون سنبھالے گا؟"

اس خود کلامی کے ساتھ ہی نادر علی نے اپنا سر سلاخوں سے ٹکرانا شروع کر دیا اور وہ میر منتظم نے جو میرے ہمراہ تھا، میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ لیا اور محافظوں کو آواز دینے لگا۔

(۱۹۷۲)

تین ٹرک گزر گئے

اُس کو نہیں معلوم تھا کہ یہ سڑک کدھر جاتی ہے۔ اور نہ وہ اُس مقام کے بارے میں جانتا تھا، جہاں اس سڑک کو جا کر ختم ہونا تھا اور نہ اُس کا ایسا کوئی مقصد تھا کہ وہ اس بارے میں سوچے، اُس کو تو بس چلتے رہنا تھا اور چلتے جانا تھا۔ اُسے اپنے آس پاس سے گزرنے والوں اور سڑک کے اِدھر اُدھر واقع عمارتوں، میدانوں کھیتوں کے بارے میں جاننے کی کوئی خواہش نہیں تھی اس کا مقصد صرف چلتے رہنا تھا اور وہ بس اتنا جانتا تھا کہ سفر کی حالت میں اُسے چلتے چلے جانا ہے۔

وہ تو بس اس خیال کو زندہ رکھے ہوئے تھا کہ وہ اُس مقررہ رفتار سے جس کو وہ اپنے بدن میں باقی رہ جانے والی سکت کے پیشِ نظر برقرار رکھنے کا تہیہ کر چکا تھا کہ بس چلتا رہے، رُکے نہیں، اُسے کوئی غرض نہیں تھی کہ آس پاس سے گزرنے والے کیا باتیں کر رہے تھے، کس کے لیے کر رہے تھے اور کیوں کر رہے تھے؟ اس سے اس کو کوئی تعلق نہیں رہا تھا، سماعت تو محض اُس کے قدموں کی چاپ سے چپک کر رہ گئی تھی، اور بصارت قدموں تلے روندی جاتے والی سڑک پر پھسلتے رہنے سے زیادہ کی بصیرت کے قابل نہیں رہی تھی یہ حالتیں اُس نے اپنے اُوپر نہایت کوشش سے طاری کی تھیں۔ یہ ایک اختیاری عمل تھا وہ اس عمل کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔ بھوک پیاس کا احساس مٹ چکا تھا،

طلب اور خواہش محض اس ایک ضرورت میں سمٹ آئی تھیں کہ بس وہ چلتا رہے اُس کو ایسا یقین آچکا تھا کہ اگر وہ کسی بھی شے سے، آواز سے، خوشبو سے، یا احساس سے متاثر ہو کر ان کا کھوج لگانے یا دل میں پیدا ہونے والی کسی بھی خواہش کو پورا کرنے کے لیے رُکا تو اس کا وہ رکنے والا قدم ہی آخری قدم ہو گا اور جب وہ قدم رکے گا تو پھیپھڑوں کی نالیوں سے گزر کر نتھنوں سے باہر آنے والی سانس بھی رک جائے گی اور وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرنا مقدّر ہے!

جس طرح ماچس کی کسی تیلی کے جلنے کا اصل مقصد وقتی اُجالا فراہم کرنا ہوتا ہے یا مقدرت ہو تو وہ تیلی کسی مشعل یا شمع جلانے کا بھی کام کر جاتی ہے۔ لیکن ماچس کی تیلی کا مقدّر بالآخر خاک ہو کر مٹ جانا ہی ہے ماچس کی تیلی جلے گی تو بجھ جائے گی اور اُس کی راکھ پھر فنا بھی ہو جائے گی۔ جب یہ سب کچھ ایسا ہونا ہی ٹھہرا تو پھر ابھی کیوں مرا جائے؟ جب تک فطرت کی ضد سے فضا اور ماحول سے لڑتے رہنے کی ذرا سی بھی قوّت موجود ہو لڑتے رہنا چاہیے اور اس مقصد کے لیے بس چلتے رہنا سب سے اچھا اور مفید تر عمل ہے اور اس طرح زندہ رہنا چاہیے کہ یہی لڑنے اور زندگی قائم رکھنے کی علامت ہے! اسی لیے اب اس کی تمام زندگی اور قوّت چلنے میں سمٹ آئی تھی، اس کا چلتے رہنا ہی اِس وقت اہم تھا۔ اس کو نہ دل کی دھڑکن کی پروا تھی نہ دماغ میں کوئی سوچ اور فکر کی نہ ماضی کی نہ مستقبل کی۔ بس وہ اس وقت اپنے حال کے لمحات میں زندہ رہنا چاہتا تھا اور اپنے جسم کے بوجھ کو گھسیٹنا چاہتا تھا۔ یہ وقت کا تقاضا تھا اور وہ اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے کسی سمت کا تعین کیے اور منزل کی جہت سوچے بغیر چلا جا رہا تھا۔

ایسا تو نہیں تھا کہ اس کا دماغ سُن تھا یا اس میں سوچنے کی قوّت نہیں رہی تھی۔ بس اس وقت سوچ اور فکر کا تعلق اُس کے دماغ کے بجائے اُس کے چلتے ہوئے قدموں

کی چاپ سے اُجڑا تھا۔ ٹانگوں کی حرکت، سڑک پر اُن کی سرسراہٹ کی آواز اور سڑک کے اُس حصّے کو دیکھتے رہنا جس پر وہ ٹانگیں گھسیٹ کر اپنے آپ کو آگے بڑھا رہا تھا گویا اس کی قوّتِ فکر، قوّتِ سماعت اور بصارت تینوں نے مل کر ایک ناقابلِ تقسیم اکائی کی شکل اختیار کر لی تھی، وہ جانتا تھا کہ اِس اکائی کو اگر کوئی قوّت ٹکڑوں میں بانٹ سکتی ہے تو وہ سوچنے کی قوّت ہے۔ سوچنا اور بامعنی سوچنا! لیکن جب وہ بے سمت اور بے جہت چل پڑا تھا اور اس وقت یہی وصف زندگی کی علامت بنا ہوا تھا تو وہ اپنی سوچ کو کوئی معنی نہیں دینا چاہتا تھا لیکن بات یہ بھی تھی کہ وہ ذہن و دماغ میں اُٹھنے والی لہروں سے نجات بھی نہیں پا سکتا تھا۔ اسی لیے اپنی فکر کی قوّت کو قدموں کی چاپ، ٹانگوں کی حرکت اور قدموں کے نیچے آ کر گزر جانے والے سڑک کے حصّے کو اُس نے اپنی قوّتِ سماعت و بصارت کا مرکزی نکتہ بنا رکھا تھا اور فکر اور سوچ کے دھاروں کو اِسی مرکز پر روک دیا تھا۔

یوں تو دراصل وہ ازل ہی سے چل رہا تھا، اور بغیر رکے دوسرے عوامل کے نتیجے میں چلتے رہنا اس کی رَوِش بن گئی تھی، اور بوجھ ڈھونا اس کا مقدر! اپنی قوّت کو برقرار رکھنے کے لیے اِدھر اُدھر منہ مار کر کچھ حلق سے اتار کر صبر کر لینا بُرا بھلا پانی، جہاں بھی مل جائے دو گھونٹ پی لینا اس کی عادت بن گئی تھی۔ اس میں طلب، ضرورت اور خواہش کو کوئی دخل نہیں رہا تھا بس وقت وقت سے ایسا کرتے رہنا اس کی یہ ایک خصلت بن چکی تھی۔ چلتے چلتے پاؤں پھٹکارنا بھی اُس کی خصلت تھی لیکن۔ جو چوٹیں اِس حرکت کے بعد اس کا مقدر بنتی رہیں اس کی تکلیف سے بچنے کی خصلت کو اُس نے اپنے بدن سے اس طرح جھٹک پھینکا تھا، جیسے ریت میں لوٹنے پوٹنے کے بعد بدن کی ایک جھرجھراہٹ سے ریت کو اتار پھینکنے پر بدن ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ جس طرح دماغ اور ذہن کی سوچ سے اگر فکر کے نئے نئے اُفق اور خیال اُبھر کر تصویریں

بندنے لگیں اور ماضی کے تجربات آئینہ دکھلانے آگے آجائیں کہ اس طرح کی سوچ کے نتیجے میں ذہن ماؤف ہوجاتا ہے تو بڑی سخت چوٹ لگتی ہے دل پر — ! اس لیے کہ وہ سب کچھ جو سوچا جاتا ہے وہ تو خواب کے آئینوں پر چوٹ پڑتے ہی کرچی کرچی ہوجاتا ہے۔ اور بس پیٹھ پر بوجھ اور تیز چلنے کی ٹھٹکار کے ساتھ شدید چوٹ لگنے سے زخمی پٹھوں کی اینٹھن ہی یاد رہ جاتی ہے اور یہ سب کچھ ایک تلخ حقیقت کا زخم بن کر اندر ہی اندر پھیلتا جاتا ہے اس لیے کوئی سمت کوئی منزل، کوئی جہت مقرر کرکے چلنے کی عادت ہی اب اس میں نہیں رہی تھی بس ایک مبہم سے اشارے پر چلتے رہنے میں عافیت کو اُس نے اپنی عادت بنالیا تھا۔ ورنہ فہم و فکر جن خیالات کو جنم دیتے ہیں وہ وقت آپڑنے پر ایک رفیق اور محبوب کی طرح کہ جو زندگی کی راحت افزا گھڑیوں میں، زیوں کے دل نشیں لمحات میں سرسبز میدانوں میں گھومنے پھرنے کی فرصت پر ساتھ تو دے سکتی ہے مگر جب مصیبت آپڑے تو وہ ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔؟ وہ تو اب ایسے رفیق ساتھیوں کی یاد کو بھی بھلا بیٹھا تھا اور ہر سفر کو اس کی صعوبتوں کے ساتھ تنہا برداشت کرنے کا سلیقہ حاصل کرچکا تھا، اور بہتر طریقہ چلتے رہنا تھا، بے سمت اور بے جہت فکر اور سوچ کے بوجھل خیالات کے بغیر چلتے رہنا اور بس چلتے رہنا! کیا اس کے حواس ختم ہو گئے تھے؟ لیکن ایسا تو نہیں تھا، بس حواس کا رُخ بدل گیا تھا، مگر جب کسی لمحے کسی حادثے یا بے احتیاطی کے سبب حواس جاگ اُٹھیں تو اُن سے فرار کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس کے نزدیک اس سے بچت کی ایک ہی صورت تھی چلتے رہو، چلتے رہو بے سمت اور بے جہت! اور چلتے رہنے کو ہی زندگی سمجھتے رہو اور نظر سامنے رکھو، گردن جھکی رکھو، قدموں کی چاپ پر کان لگائے رہو اور جو کچھ سامنے پڑا نظر آئے اس کو سونگھنے کی بھی کوشش نہ کرو!!

چلتے چلتے جب جسم سے ٹھنڈی ہوا ٹکرائی تو اُس کی ننگی پیٹھ پر سردی کی ایک لہر

دوڑ گئی جس سے اُس کے خفتہ حواس کو ایک جھٹکا سا لگا اور ایک لطیف سا سُرور اُس کے بدن میں تیر گیا لیکن اُس نے اپنے ذہن و دماغ تک اس خوش گوار سرور کی لہر کو پہنچنے سے روکنے کے لیے ایک جھُرجھُری لی اور سماعت، بصارت اور قوّتِ رفتار کی ٹوٹتی ہوئی اکائی کو بکھرنے نہ دینے کے لیے ایک گہرا سانس لیا تب ہی سوچ کے اندھیرے سے ایک کرن سی پھُوٹ بہی شاید صبح ہونے والی تھی۔

صبح کی جادو اثری سے وہ واقف تو تھا لیکن برسوں کی تھکن نے اُس پر جو گرد چڑھا دی تھی اور اپنے حواس کو جس طرح اُس نے اپنے جسم کی چہار دیواری کے اندر بند کر رکھا تھا جس کے باعث اس کا ذہن بوجھل اور پژمردہ اور موسم کے اثرات اور روز و شب کے لُطف و نشاط اور کرب سے ناآشنا ہو چکا تھا۔ بس ان کا ایک ہلکا سا پرتو ایسا جیسے ریتیلے میدان میں ابھرنے والے قدموں کے نشانات کو نرم رو ہوا ریت ہی کے ذرّوں سے ڈھانپ دیتی ہے مگر مٹاتی نہیں ایسے مٹیالے نقوش کہیں کہیں اُس کے ذہن پر ضرور ابھرے پڑے تھے۔

"صبح کے کیف سے لطف اندوز ہونا چاہیے" اس کے فکر کی سانس نے ایک اُبھار کی صورت اختیار کرنی چاہی۔ مگر اُس نے پھر ایک جھُرجھُری لے کر اس سانس کو ادھورا چھوڑ کر فکر اور سوچ کی ہر جہت کو اپنے اندر سمیٹ لینا چاہا، اس عمل سے اس کی نگاہ کچھ اوپر اٹھی جس کی وجہ سے آنکھوں کے کناروں سے سڑک کے پاس سبزہ سا دکھلائی دیا، وہ تو سبزے کے رنگ تک کو بھُول چکا تھا، مگر احساس تو مٹ کر بھی نقش چھوڑ جاتا ہے۔ اُس کی گردن بھی اُٹھی اور اُس کی نگاہوں نے سامنے اُن عمارتوں کو بھی دیکھا جن کی تعمیر میں اس کی توانائی اور گزر جانے والی عمر اور محنت شامل تھی اُس کے باطن کی نگاہ بھی ذہن کے تہہ خانوں تک جا پہنچنے کی راہ ڈھونڈنے لگی۔

" وہ جب بچّہ تھا تو وزن ڈھوتی ہوئی اپنی ماں کے ساتھ ساتھ وہ بھاگتا رہتا تھا،

وہ اُسے یاد آگئی اور پھر جب دو چار قدم اُٹھا کر وہ آگے بڑھا تو جوانی کی وہ رفیق بھی یاد آئی پھر محنت کرنا اور محبت کرنا، وزن ڈھونا اور پیار کی خوشبو کے پیچھے بھاگنا یہ سب کچھ یاد آنے لگا۔

"کیا زندگی تھی! کیا زندگی ہے؟!!

اس کی سوچ نے پھر طرارہ بھرنا چاہا۔

"لیکن موت بھی تو ہے۔ اُس کو قبول کرنے سے پہلے کم سے کم موت کو دھوکا دینے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے، جو مقدر ہو چکا وہ تو ہوگا۔ اگر مار سے بچنا محال ہو تو اُس سے بچاؤ کے طریقوں پر سوچ بچار کرنے سے مار کی چوٹ میں کمی کا احساس تو بہرحال جاگنے لگتا ہے!"

اس سوچ کے ساتھ ہی اُس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور ایک جھرجھری لے کر گردن نیچے جھکا دی اور نگاہیں پھر قدموں کے نیچے آکر گزرتی سڑک کے اُس ٹکڑے پر مرکوز کر دیں جو قدم کے آگے بڑھ جانے کے ساتھ ہی پیچھے رہ جاتا ہے ہر اُٹھتا قدم مستقبل اور ہر گزر جانے والا قدم ماضی بن رہا تھا۔ اُس نے پھر اپنی تمام تر کوشش اور ہمّت کا سہارا لے کر سماعت، بصارت اور بصیرت کو ایک اکائی کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب رہا۔ اب پھر وہی قدموں کی چاپ، سڑک پر جمی ہوئی نظر اور محض چلتے رہنے کا عمل ایک اکائی میں ڈھل کر اُس کے حواس پر قابو پا چکا تھا۔ مگر سماعت نے کچھ دیر بعد ایک عجیب اور بھیانک لیکن گوش آشنا آواز کو سنا وہ اس سے واقف بھی تھا لیکن یادوں کی دھند میں وہ آواز کہیں اپنی اصل شکل و صورت واضح نہ کر پائی۔

یکایک اُس نے اپنے پچھلے دھڑ پر ایک زبردست چوٹ اور جھٹکا محسوس کیا یہ آواز ایک ٹکراؤ کی تھی پھر ٹرک کے ٹائروں اور پہیوں کے سڑک پر پھسلنے کی آواز! اور پھر! اُس نے اِن پہیوں کے گزر جانے کے بعد اپنا سفر پھر جاری رکھنا چاہا

اور اپنی ٹانگیں ہلانے کے عمل کو پھر شروع کیا، اس کی ٹانگیں ہلتی رہیں لیکن وہ آگے نہیں بڑھ سکا، اُس کی نگاہوں میں سڑک کے گزرتے ٹکڑے کے بجائے پہلے گہرا نیلا رنگ اتنا جو سیاہی میں تبدیل ہوا، اور پھر سُرخ ہو گیا اور اس کو اپنی اکائی کے ٹوٹ کر بکھر جانے کا احساس ہوا۔ حلق سے ایک نمکین رطوبت پہلے جبڑوں تک آئی اور پھر نتھنوں سے نکلنے والی سانس مل کر سڑک پر پھیلنے لگی۔

"کیا یہی مقدر تھا؟ اُس کے دماغ میں ایک ٹیس اٹھی۔

"نہیں۔ یہ مقدر نہیں تھا!"

فکر کی یہ دونوں سوچیں آپس میں گڈمڈ ہو کر اس کی سانس گھونٹنے لگیں۔ اُس نے پھر اپنا سفر جاری رکھنا چاہا، مگر ہلتی ہوئی ٹانگوں نے آگے بڑھنے کے ارادے کا ساتھ نہیں دیا۔

یکایک ایک اور آواز۔ ایک اور جھٹکا۔ ایک اور تکلیف اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک اور۔۔۔!!

اب سڑک پر وہ روندا ہوا پڑا تھا، اُس سے ٹکرا کر تین ٹرک گزر گئے تھے۔ اور باہر پڑا ہوا سب کچھ بکھر کر ایک اکائی کی صورت میں اُس کے دماغ کی طرف سمٹ گیا تھا۔ اس کی نگاہوں سے نیلی، کالی اور سُرخ دھند چھٹ چکی تھی اور وہ سامنے کا روشن روشن منظر دیکھ رہا تھا، سامنے ایک طرف وہ سب عظیم عمارتیں تھیں جن کو اُس نے اور اُس کے دوسرے ساتھیوں نے کنکر، پتھر، بجری، ریت، سیمنٹ اور پانی ڈھو ڈھو کر اُن کی تعمیر ہونے میں مدد دی تھی اور دوسری طرف، کچھ بنگلے اور فوجی بیرکیں تھیں جہاں سے یہ ٹرک ہو کر گئے تھے۔ اُس کی ناتواں ٹانگیں اب نہیں ہل رہی تھیں مگر اُس کے سفر کی رفتار جاری تھی۔ اُس کی ٹانگیں بوجھ نہیں اُٹھا سکتی تھیں مگر اُس کا ذہن اور دماغ اب ایک اکائی بن کر ایک نئی شکل اختیار کر رہے تھے اور ایک نئے سفر کا ارادہ باندھ رہے تھے۔

اُس کا مقدر اُس کے سامنے تھا۔ ذہن میں جو آخری تصویر اُبھری، وہ ایک ننھے بچے کی تھی، ایک خوب صورت بھورے سُرمئی رنگ کی کھال، جس کے چار نازک نازک پاؤں بدن کا بوجھ اُٹھائے ہوئے تھے اور اُس کے بچے کے پھیلے ہوئے ملبوترے منہ سے اوپر پیشانی پر ایک سفید ستارہ چمک رہا تھا، گو کہ بچہ اُس کے ساتھ کبھی نہیں رہا، وہ اپنی ماں کے ساتھ ماں کی خوشبو کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا چلتا رہتا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ اس کا مقدر یقیناً اُس سے مختلف ہوگا۔ اس لیے کہ یہ چوٹ، یہ زخم یہ جھٹکے اُس نے خود سہہ لیے ہیں۔ اب اس ذہن میں چھپے ہوئے اس بچے کو تو اُن چوٹوں سے محفوظ رہنا چاہیے اس بچہ کا مقدر یقیناً اس سے مختلف ہوگا۔ اُس کی ڈوبتی سماعت نے ایک بار پھر گھن گرج سی سنی۔ ایک خیال ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کے دماغ تک چڑھتا چلا گیا۔

"کیا اور کوئی ٹرک آرہا ہے پھر؟" وہ مجھ پر سے گذر سکتا ہے، اُسے گذر جانے دو۔ اس لیے کہ اِس سڑک پر تو صرف میں پڑا ہوا ہوں، زخمی قریب المرگ شاید اس سڑک کو میرے لیے تو یہاں پر ہی ختم ہو جانا تھا۔!"

اور دل سے اُٹھ کر دماغ کی طرف بڑھتا ہوا خون کا دھارا اُس کے حلق سے اُتر کر نتھنوں سے ہوتا ہوا سڑک پر بکھر گیا۔ اب وہاں ایک نحیف و نزار اُدھڑے ہوئے جسم کے گدھے کی لاش پڑی تھی جس کو تین ٹرک مارتے ہوئے کچل کر گذر گئے تھے مگر صبح کا اُجالا پھیلنے کے لیے روشنی پر تول رہی تھی!۔

(۱۹۷۷)

لال ہرے سگنل

میں بہت دور سے چل کر یہاں پہنچا ہوں پہاڑوں کے پیچھے اُس وادی سے جہاں فطرت اپنے جلال و جمال کے ساتھ چھائی ہوئی ہے۔

جس طرح درخت سے ٹوٹے ہوئے پتّے ہوا کے رُخ پر اُڑتے ہیں میں بھی انسان کی سانسوں کی خوشبو اور خون پسینے کی بُو باس کے پیچھے چل کر یہاں پہنچا ہوں پہاڑی وادی کی بلندی سے اُتر کر، میں نے میدانی پھلوں اور جڑی بوٹیوں سے اپنی بھوک مٹائی ہے آبشاروں کا میٹھا اور ٹھنڈا پانی پیا ہے۔ پرندوں کے چہچہے سنے ہیں، درندوں کی دہاڑوں سے ڈرا ہوں، خوب صورت مَن موہنے چرندوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھا ہے۔ میدان کی لطیف اور نرم ہواؤں میں گہرے سانس لیے ہیں۔ خوش رنگ اودے نیلے اور پیلے پھولوں اور سرخ گلابوں کی تراوٹ آنکھوں میں بسائی ہے۔ نئی نئی خوشبوؤں سے دماغ معطّر کیا ہے۔ مجھے راستوں سے گزر جانے والے قافلوں کے اجڑے پڑاؤ ملے ہیں۔ ان کے بُجھے ہوئے الاؤ میں نے دیکھے ہیں جن کی راکھ میں اب نہ کوئی چنگاری تھی نہ گرمی! انسانی بدن کی خوشبو خون کی بو باس اور تیز ہواؤں سے ہلتے درختوں کے پتّوں سے گزر کر آنے والی سنسنی خیز سسکیوں نے میرے خون کی گردش بڑھائی بھی ہے اور میں گرم تپتی تنہا دوپہروں سے بھی گزرا ہوں، ایسی دوپہروں سے جن میں سائے کی راحت کو بدن محسوس ہی نہیں کر پاتا۔ گھنگھور گھٹاؤں، تیز برستے

پانی سے بن جانے والی کیچڑ اور دلدل سے بھی گزرا ہوں۔ اندھیری بھیانک برسات کی راتوں کو سوتے جاگتے گزارا ہے۔ اور اب یہاں آ بیٹھا ہوں، انسان نے فطرت کو قابو میں کر کے سفر کے لطف کو چھین تو لیا ہے، لیکن کچھ نئی حقیقتوں سے انسان کو اس طرح آشنا کیا ہے کہ اب یہ حقیقتیں بھی بھلی لگتی ہیں۔ ان سے مجھ جیسے مسافروں کا بھی دل لگ جاتا ہے۔ فطرت کو انسان نے پالا پوسا ہے اور اب انسان فطرت کو اپنا مطیع بناتا چلا جا رہا ہے۔

جہاں میں تھک کر آ بیٹھا ہوں۔ یہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن کی مختصر سی عمارت سے کچھ دور پیپل کا درخت ہے اس کی چھاؤں گھنی ہے ہوا چلتی ہے تو پتے لوریاں دے کر سلانے لگتے ہیں۔ اس کے سامنے سے ریل کی پٹری گزر رہی ہے دو پٹریاں ایک دوسرے کے متوازی بچھی ہیں، ان پٹریوں کے کنارے کنارے باریک سے تار کھینچے ہوئے ہیں، جو آگے جاکر لال ہرے سگنل میں گھس گئے ہیں۔ ریلوے لائن کی عمارت کے اندر سے ایک انسان ان تاروں کو کھینچتا ہے اور کبھی چھوڑ دیتا ہے جس سے سگنل گرتا ہے اور پھر اپنی جگہ آجاتا ہے۔

دور تک بچھی ہوئی یہ پٹریاں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں، ایک دوسرے کی ہم سفر ان میں باہم ملنے کی خواہش کی سنسناہٹ اس طرح امر ہو چکی ہے کہ اب اس خواہش کی تپش رہی ہے نہ تڑپ! سنگ سنگ رہتے ہوئے بھی ابد کی دوری کا لمحہ ان کے درمیان پڑا سسکتا رہتا ہے۔

اسٹیشن کی عمارت کے سامنے سے گزرنے والی کچھ اور پٹریاں یکایک کبھی ایک دوسرے کے قریب کر دی جاتی ہیں اور کبھی دور، اس طرح کہ ایک شخص آکر لوہے کے ایک ہتھے کو کھینچتا ہے تو کھٹاک کی آواز کے ساتھ یہ ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں، اور جب ان کو جدا کیا جاتا ہے تو ایسی سسکاری اور سینے کو کاٹ کر یکایک گزر جانے والی تلوار کی دھار کی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے جو آس پاس کے ہر ایک ذرے کو چیر کر رکھ دیتی ہے۔

میں پیپل کے اس درخت کے نیچے لیٹ کر، اپنا ایک بازو سر کے نیچے رکھ کر لیے:

دوسرے بازو سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیتا ہوں، اور پیپل کے پتّوں کی لوری مجھے تھپکنے لگتی ہے۔ ہوا کی سنسناہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں ہے۔ دوپہر کی غنودگی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے اور بند آنکھوں کے پپوٹوں کے نیچے آہستہ سے ایک منظر ابھرتا ہے۔ ایک بچّہ پیپل کے سائے تلے سو رہا ہے۔

"تم جانتے ہو کہ یہ کون ہے"؟ یہ آواز پیپل کے پتّوں کی سرسراہٹ سے ابھرتی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ جانا چاہتا ہوں لیکن میں جہاں سو رہا تھا میں وہاں نہیں ہوں، وہاں تو ایک بچّہ سو رہا ہے اور میں تو پیپل کی سب سے اونچی پھننگ پر جا اٹکا ہوں،

"یہ وہ بچّہ ہے جس نے تمہارے پُرکھوں میں سے سب سے پہلے کو قتل کیا تھا"۔ میں پتوں کی اوٹ سے اُسے دیکھنا چاہتا ہوں، پیپل کی پتّوں کی دھوپ چھاؤں میں وہ کچھ نظر آتا ہے کچھ نہیں۔ میں ادھر اُدھر سرک کر اُسے دیکھتا ہوں یکایک میری نگاہیں اس کے چہرے پر پڑتی ہیں۔ "کتنا معصوم چہرہ ہے، میں سوچتا ہوں"۔ اس کے چہرے پر قاتلوں کی سی سختی نہیں ہے اس نے میرے پُرکھوں میں سب سے پہلے کو کیسے قتل کیا ہوگا؟۔ نہیں یہ قاتل نہیں ہو سکتا۔"

سنہرا چمپئی رنگ، خوب صورت نقش و نگار اس کی نازک سی ناک کے نتھنوں سے نکلتی اور سینے میں سماتی ہوئی سانس، جیسے بہار کی پہلی خوشبو ! سنہرے بال، مخروطی ہونٹ شفاف بدن پر کوئی کپڑا ابھی نہیں، ناف سے نیچے بس ایک خوش رنگ چیتھڑا اٹکا ہوا ہے۔

"جھوٹے !" میں زور سے چیختا ہوں، پیپل کے پتّے ہنسنے لگتے ہیں، میری آواز کی بازگشت خود مجھے ہی سنائی نہیں دیتی۔

میں گھبرا کر اپنے چاروں طرف دیکھتا ہوں یہ وہ جگہ تو نہیں جہاں میں ابھی لیٹا تھا، نہ وہ ریل کی پٹری نہ اسٹیشن کی عمارت، نہ وہ سگنل اور نہ اس کے تار — !!

"یہ جگہ اتنی اجنبی سی کیوں ہے؟" میں سوچتا ہوں اور پیپل کے پتّوں کی سرسراہٹ

سے ایک جملے کا ایک حصّہ میرے کانوں سے پھر ٹکرا تا ہے۔

"تمھارے پُرکھوں میں سے سب سے پہلے ب"۔ میرے ذہن میں ایک سنسنی دوڑ جاتی ہے۔ جیسے گیلے سوکھے پتّوں کے بیچ سے کوئی سانپ رینگ گیا ہو۔

"اپنے پُرکھوں میں سے سب سے پہلا تو میں ہی ہوں۔ تو اس بچّے نے مجھے ہی قتل کیا تھا؟ اتنے پیارے اور معصوم بچّے نے!!۔ تو کیا قاتل ایسے ہوتے ہیں؟ ایسے بچّے! جن کی ناک کے نتھنوں سے آتی جاتی سانس کلیوں کے کھلنے کی طرح حسین اور دلفریب ہوتی ہے، اور یہ خوب صورت نازک سے ہونٹ جن پر مسکراہٹ جھیل میں ہلکورے لیتی لہروں کی طرح اُبھر کر پھیلتی ہے اور کبھی سمٹ کر جھیل کنول بن جاتی ہے؟ اور جو ستاروں کو چمک اور بارش کے پہلے قطرے کو جسارت اور کشادگی کی قدرت عطا کرتی ہے؟"

پیپل کے پتّوں نے تیز ہوا کے جھونکوں سے اٹھلا کر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ مجھے احساس ہوا جیسے سب مل کر ہنس رہے ہیں اور ان کی دبی دبی ہنسی "یہی قاتل ہے"۔ کے تال دے رہی ہو۔ یہ سُن کر مجھے محسوس ہوا جیسے طول طویل جنگلی میدانوں میں ہزاروں چوپائے دوڑتے ہوئے میری طرف آ رہے ہیں۔

میں کانپ اٹھا۔ پھر میں نے گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور سرپٹ دوڑنے کی تیز دل ہلا دینے والی آوازیں سنیں۔ مجھے اپنے سینے پر ان دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپوں کا ظالم بوجھ محسوس ہوا، وہ مجھے روندے ڈال رہے تھے۔ یکایک ایک تیز دردناک آواز کے ساتھ ایک ایسی چنگھاڑ نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا جو مظلوموں کو برباد کر دینے والے لوگ وحشیانہ اور اپنی دانست میں فاتحانہ نعرے کے طور پر لگاتے ہیں ایسی پُرخراش آواز جس سے فضاؤں کے بھی سینے شق ہو جائیں۔

"کھٹاک کھٹاک!!!" میں چونک پڑا۔

طویل سیٹی کے بعد ریل کا انجن اپنے پیچھے ڈبوں کو کھینچتا ہوا اسٹیشن کی حدود میں داخل

ہو رہا تھا۔

پیپل کی چھاؤں، میرے سینے سے کھسک کر پاؤں تک جا پہنچی تھی، میرا سینہ اور چہرہ دھوپ سے بوجھل ہو رہا تھا۔ کھٹاک کھٹاک کی آواز سے ریل کی پٹریاں ایک دوسرے سے جدا کر کے کسی اور سے جوڑ دی گئی تھیں تاکہ ٹرین چشم زدن میں اسٹیشن پر رکے بغیر گزر جائے۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے پیر سکیٹر کراُن پر نظر ڈالی جو مجھ سے بے حرکت آواز دل میں کہہ رہے تھے کہ مجھے تو ابھی اور آگے جانا ہے، سو میں اُٹھ کر چل پڑتا ہوں اور میری سوچ بھی رواں دواں ہو جاتی ہے۔

"تو یہ وقت ہے! جو ننھے چہروں کو کڑی دھوپ میں جلا کر کرخت کر دیتا ہے اور پھر پُرکھوں میں سے پہلے کو قتل کرا دیتا ہے!! وقت کا وہی لمحہ جو گزرے قافلوں کے پڑاؤ کے بُجھے الاؤ کی راکھ کو بھی ٹھنڈا کر دیتا ہے اس میں آگ، چنگاری اور گرمی معلوم نہیں ہوتی وہ تو ذرّوں کے سینے میں اُتر کر ٹھنڈی نیند سو جاتی ہے اور اُس انسان کا انتظار کرتی ہے جو ذرّے کا سینہ چیر کر اس سے فیض اٹھاتے آگے بڑھے گا۔ ورنہ انسان تو انسانوں کی سانسوں، بدن کی خوشبو اور خون پسینے کی بو باس کے پیچھے اپنی فکر کو محنت، طاقت اور تاریخی جبر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک دوسرے سے گتھا ہوا اس طرح رواں دواں ہے جیسے یہ ریل کی پٹریاں جو مقرّرہ فاصلے سے خاموش بچھی ہوئی ہیں اور جن کو ضرورت کے تحت اسٹیشن کے اندر سے تار کھینچ کر لال ہرے سگنل دکھائے جاتے ہیں یا اسٹیشن سے باہر نکل کر کوئی اس ہتھوڑے کو کھینچ کر پٹریوں کو قربِ وصل کی اجازت دیتا ہے اور کبھی فراقِ دائمی کی! اور ان پر سے گزرنے والی ٹرین آگے کہیں گزر جاتی ہے اور وہی ایک لمحہ جو کسی ذرّے کے سینے میں دفن ہوتا ہے، وصل کی گرمی کے احساس کو ٹرین کے پہیوں کے ذریعے سے ان سرد اور فراق زدہ پٹریوں کو لمحاتی لمس عطا کرتا ہوا مستقبل کے انتظار میں ماضی کی رِدا اوڑھ کر پھر سو جاتا ہے!!

(۱۹۷۸)

اندر کا موسم

دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد جب میں نیچے سڑک پر آیا تو آج مجھے موسم کچھ خوشگوار سا محسوس ہوا۔

بات یوں ہے کہ کراچی میں کوئی موسم تو ہوتا نہیں، یہاں کے بسنے والوں نے تو خود ہی موسموں کی خوش گواری اور ناخوش گواری کو اپنے آپ میں اتارنے کا سلیقہ اختیار کر رکھا ہے موسموں کا تعلق تو بدلتی رتوں سے ہوتا ہے اور کراچی میں انسان کے اندر کی رتیں بدلتی رہتی ہیں اور باہر کی رتیں کراچی میں حلقوں اور علاقوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ڈیفنس سوسائٹی اور کلفٹن کا موسم الگ ہے اور ناظم آباد اور لیاقت آباد کا الگ۔ گلشن اقبال کا موسم برنس روڈ اور بمبئی بازار کے موسم سے جدا ہے۔ نیو کراچی اور اورنگی ٹاؤن کا موسم کچھ اور ہوتا ہے۔ شہر کراچی میں ان موسموں سے الگ بھی کچھ اور علاقائی موسم ہیں جیسے چاکیواڑہ اور لیاری کا موسم، گولیمار اور غریب آباد کا موسم اور کیماڑی کا موسم۔ یہ سب موسم ایک ہی دن اور ایک ہی گزرتے لمحے میں الگ الگ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ان موسموں کا تعلق مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے حالاتِ روزگار اور ان پر پڑنے والے اثرات سے ہوتا ہے۔

تو جس وقت میں نے بڑی سڑک پر قدم رکھا تو مجھے موسم کچھ خوش گوار سا محسوس ہوا اس کی وجہ میرے "باس" کی مجھ پر آج کچھ نظرِ کرم تھی۔ نہ جانے کیوں آج ان کے چہرے

پر اس وقت تناؤ نہیں تھا جب میں اُن کی پیشی میں پہنچا۔ اُن کی آنکھوں میں چشمے کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے غصہ کے بجائے ایک جذبۂ تلطف اور عطاء مہربانی کا انعکاس نظر آرہا تھا میرے "باس" کا چہرہ تو ہمیشہ سرخ رہتا ہی ہے مگر سپاٹ، جیسے ایک اچھے چہرے پر کوئی کھُردری چھلی دار نقاب چڑھالی گئی ہو۔ آج نگر ایسا نہیں تھا بلکہ اُن کے موٹے موٹے خونِ کبوتر کی طرح سرخ ہونٹ بھی بالکل لٹکے ہوئے نہیں تھے۔ مجھے تو اُس وقت اُن کے لبِ لعلیں خوب صورت انداز میں نیم وا کھِلے ہوئے گلاب کا پھول نظر آئے جب ان ہونٹوں سے یہ الفاظ اس طرح نکلے جیسے چنبیلی کے پھول چاندنی رات میں مہک اٹھتے ہیں کہ !:

"تشریف رکھیے۔ آپ کا کام کیسا چل رہا ہے؟"

یہ جملے اور باس کا یہ انداز کبھی کبھار ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے مجھ پر تو ان کے اس اندازِ تلطف وعطائے محبوبی سے کچھ ایسا اثر ہوا، جیسے گھر میں جھاڑ دپونچھا لگانے والی "مائی" نے میری طرف از راہِ کرم مسکرا کر دیکھ لیا ہو۔ میں اگر کسی عورت کو اپنی بیوی کے علاوہ گہری نظر سے دیکھنے کی جرأت کر سکتا ہوں تو وہ "مائی" کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ شاید لوگ اپنی محبوباؤں کو ایسی ہی ترستی نگاہوں سے دیکھتے ہوں میرے ساتھ تو مجبوری یہ رہی کہ نہ میں کبھی جوان ہوا، اور نہ ہی کوئی محبوبہ ملی بس بیوی مل گئی اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی! اور اب نہ بیوی میری طرف التفات سے دیکھتی ہے اور نہ میں اس کو پیار سے دیکھنے کا موسم پاتا ہوں، ہم دونوں نے ایسے موسموں کو اپنے اپنے ذہن کے نہاں خانوں کے سرد اور اندھیرے مرتبانوں میں اتار کر محفوظ کر دیا ہے۔ مجھے روزی روزگار کی فراہمی کے موسم یاد رہے اور اس کو کم خرچ میں گھر چلانے کا موسم یاد رہا۔

تو جب میں باہر بڑی سڑک پر آیا تو میرے "باس" کی نظرِ کرم نے کہ جو دل و

جان کو جنتِ نگاہ بنا دینے والے محبوب کی نظر سے کسی طرح کم نہ تھی، میرے دل میں اتر کر مرجھائے ہوئے موسم کو خوش گوار بنا دیا تھا اور ہریالی نہ ہونے کے باوجود وہ نظر ہر طرف ہریالی کی خوشبو کا احساس بن کر پھیل گئی تھی۔

میں روزانہ بڑی سڑک سے بس میں ٹھُس ٹھُسا کر گھر کی طرف یا پھر کسی اور جگہ جانے کو سوار ہو جاتا ہوں۔ مگر آج میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک کی فٹ پاتھ پر روانہ ہو گیا، آج پیدل چلنے کو جی چاہ رہا تھا، یہ "باس" کی نظرِ عنایت کے موسم کا ہی اثر تھا کہ فضا میں نکھار کا احساس ہو رہا تھا حالاں کہ دھواں اگلتی چھوٹی بڑی بسیں اور گاڑیاں، شور کرتی موٹر سائکلیں اور رکشائیں پاس سے گزرتی چلی جا رہی تھیں مگر آج اُن کے شور سے نہ میرے سر میں جھٹکے لگ رہے تھے اور نہ فضا کی آلودگی اور گھٹن میرا گلا گھونٹے ڈال رہی تھی۔

ابھی میں چند ہی قدم چلا تھا کہ مجھے اپنی گدّی کے پیچھے کچھ چبھن سی محسوس ہوئی۔ میں نے گدّی کو سہلایا اور چلتا رہا، لیکن اب گدّی میں ٹیس سی محسوس ہونے لگی تھی، میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے قریب یا دور کوئی شخص میری طرف غور سے دیکھ رہا ہے اور وہ میری گدّی پر آنکھیں گڑائے ہوئے ہے اور اسی وجہ سے یہ چُبھن ہو رہی ہے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا اور ______

ارے یہ کیا واقعی یہ تو ایک ہنستا مسکراتا لال چہرہ، خوشی سے تمتماتا ہوا، اور اس کے کشادہ پیشانی کے نیچے اس کی صاف شفّاف مسکراتی ہوئی نہیں بلکہ ہنسی کے فوّارے چھوڑتی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ایک معصوم سی بوڑھی عمر والے چہرے پر جوانوں کی شگفتگی اور بچّوں کی معصومیت بکھری ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جیسے برطانیہ کے آں جہانی جارج پنجم کی شبیہہ لیے کوئی جسم سڑک پر اُتر آیا ہو۔ اس کی داڑھی بھی اس کے چہرے کے تناسب سے بڑی شائستہ تھی۔

میرے قدم رک گئے، اس کے قدم اٹھتے رہے میں نے سوچا۔

"یہ کون ہے؟ اور کیا اس کو مجھ سے کوئی کام ہے۔" وہ قریب آتا گیا میں نے اس کو کبھی نہ دیکھا تھا، نہ ایسے کسی شخص سے کبھی میری ملاقات ہوئی تھی "آخر بات کیا ہے؟" اس کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ مجھ سے ہی ملنا چاہتا تھا۔ اس نے قریب آکر بڑی بے تکلفی سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا، اس کا پورا وجود ایک ایسے روایتی بوڑھے کا سا تھا جس کی تصاویر اکثر بچوں کے لیے انگریزی میں لکھی جانے والی کتابوں میں بنائی ہوئی ہوتی ہیں۔ سرخ سرخ گال اور مسکراتی ہوئی آنکھیں۔

"بھئی کہاں بھاگے جا رہے ہو" اس نے کہا اور پھر اس کی آنکھوں اور چہرے کے ساتھ ساتھ اس کے ہونٹ اور پھر تمام بدن ہنسی کے مارے ہلنے لگا پہلے چند ہلکے ہلکے قہقہے اور پھر گہرا قہقہہ جیسے کسی تانبے یا پیتل کے بڑے برتن میں پانی کو زور زور سے ہلا دیا گیا ہو، وہ ہنستے لگا اور میں صرف اس قدر کہہ سکا۔ "جی!" اس نے ہنسی روک کر جواب دینے کے بجائے بڑی اپنائیت سے نہایت شگفتہ انداز میں جواب دیا۔

"آپ ہی سے کام ہے۔ مگر آپ مجھے نہیں جانتے، بھائی! اس کراچی میں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ ہم تو بس کبھی کبھار یہاں چلتے پھرتے ایک دوسرے کو اندر سے پہچان لیتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ آپ ادھر سامنے کی طرف ہی جا رہے ہیں نا۔ تو آیئے"

اس نے میرا ہاتھ تھام کر میرے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔

میں نے سوچا۔ "یہ کوئی دھوکے باز ہے، اس کو خیال ہوگا کہ میرے پاس کچھ پیسے ہوں گے۔ لیکن آج تو پہلی تاریخ بھی نہیں ہے پھر میرے پاس اس گھٹیا اور بدنما لباس کی جیبوں میں بھلا پیسے کا شبہ کیا معنی ہے؟"

”آپ تو حیران ہو گئے۔ ہاں ویسے حیران ہونے کی بات ہے بھی۔ آپ سے میرا ایک سوال ہے۔ اس فٹ پاتھ اور اس کے مقابل کے فٹ پاتھ پر سے گزرنے والے تمام چہروں کو میں دیر سے پڑھ رہا ہوں، میرے اس سوال کو آپ ہی پورا کر سکتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”لیکن دیکھیے صاحب۔ میں کسی کا کوئی سوال پورا نہیں کر سکتا۔ میری جیب میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سوائے دو تین روپوں کے جن سے میں گھر تک جانے کے لیے بس کا ٹکٹ خرید سکتا ہوں۔“ میں نے اس سے گھبرا کر جواب دیا۔

”ارے چھوڑیے صاحب پیسوں کو۔ میرا سوال تو بہت ہی معمولی ہے اور آپ اس کو قطعی پورا کر سکتے ہیں۔“ اس نے خود رک کر اور مجھے روک کر میرے سامنے آتے ہوئے جواب دیا۔

میں یکایک بہت گھبرا گیا، خوف اور ڈر کا موسم میرے بدن میں تیر گیا۔ میں نے بڑی لجاجت سے اس سے کہا ”خدا کے لیے مجھے جانے دیجیے۔ مجھے بہت جلدی ہے۔“

”اوہو۔ آپ تو خواہ مخواہ خوف زدہ ہو رہے ہیں۔ میرا سوال تو صرف اس قدر ہے کہ ....“ اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ہمارے پیچھے سے بھاگتے ہوئے چند لڑکے ہمارے درمیان آ گئے۔ وہ آسمان پر نگاہیں جمائے پتنگ لوٹنے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے سوچا میں بھاگ جاؤں، لیکن اس سے پہلے وہ میرے ہاتھ کو تھام چکا تھا۔

”دیکھیے میرا سوال یہ ہے کہ۔“ لڑکے درمیان سے بھاگ چکے تھے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ”بس یہ ہے میرا سوال کہ کیا میری خاطر آپ صرف ایک بار چھینک سکتے ہیں؟“

"کیا مطلب؟" میں بھنا گیا "یہ شاید کوئی پاگل ہے۔" میں نے سوچا "چھوڑیے میرا ہاتھ!"

"خدا کے لیے مجھ پر کرم کیجیے آپ کو اللہ تعالیٰ اس کا اجر عطا فرمائیں گے۔" اس نے نہایت عاجزی سے درخواست کی۔ "آپ ایسا کر سکتے ہیں، مجھے آپ کا چہرہ دیکھ کر ہی یقین ہو گیا تھا۔ آپ ضرور میری خواہش پوری کریں گے۔" اس کے چہرے آنکھوں اور پیشانی کی تمام شگفتگی اور گل و گلزار قسم کی طمانیت اب لجاجت عاجزی اور التجا میں بدل چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ رو پڑے گا۔

میں اس کو دیکھنے لگا، اس کو اپنے اندر کا موسم دوسروں کے اندر اُتارنے کا ہنر آتا تھا۔ میں نے دل میں سوچا "کیا کروں" اس کا سوال ٹیڑھا تھا مگر دل اس کی رفاقت سے محروم ہونے کو آمادہ نہیں تھا شاید وہ اپنے سحر میں مجھے لے چکا تھا۔
"دیکھیے۔ مجھے اس وقت چھینک نہیں آ رہی ہے۔" میں نے اس سے بہت سلجھاؤ اور رسان کے ساتھ کہا۔

"کوئی بات نہیں، آئیے، وہ جو سامنے ہوٹل ہے، اس میں چلتے ہیں، پہلے آپ میرے ساتھ چائے پیجیے۔ پھر ایک چھینک" اس نے یکایک میری آنکھوں میں اُتر آنے والی بیزاری کو پڑھ لیا اور بولا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں جیب کترا ہوں نہ دھوکے باز اور میں پاگل بھی نہیں ہوں، یہ دیکھیے میرے پاس پیسے ہیں۔" اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند نوٹ نکالے اور بولا۔

"مجھے یقین ہے آپ میری اس درخواست کو، اس خواہش کو، میری اس آرزو کو نہیں ٹالیں گے۔ آپ تو ادیب ہیں نقاد ہیں ادبی رسالوں میں آپ کی نگارشات میں نے دیکھی ہیں۔ آپ سنگ دل بے درد اور ظالم نہیں ہو سکتے۔"

"یا خدا - کیا آپ مجھے جانتے ہیں" میں نے گھبرا کر پوچھا اس کے چہرے پر، اس کی آنکھوں میں ایک پیارے سے بوڑھے کی معصومیت پھر اُمنڈ پڑی تھی۔ میں نے دل میں کہا "آج بُرے پھنسے یہ شاید کوئی خفیہ محکمے کا آدمی ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "ابھی بہت وقت ہے آپ کو چھینک ضرور آجائے گی۔ اور ہاں ابھی چائے پینے کے بعد آپ اور ہم اُس ادبی نشست میں بھی چلیں گے آپ شاید وہیں جانے والے ہیں آپ کو اس نشست کی صدارت جو کرنی ہے۔" "ارے میرے اللہ" میں نے دل میں کہا "یہ سب سچ ہے۔ اب کیا ہوگا؟ اس کو شاید میری نگرانی پر معمور کیا گیا ہے۔"

"دیکھیے نہ میں آپ کے ساتھ چائے پینے جاؤں گا اور نہ ادبی نشست میں جاؤں گا۔ آپ میرا پیچھا کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجیے یہ آپ کے فرائض میں داخل ہے ضرور انجام دیجیے فرائض" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے بُشرے سے یکایک بڑی عاجزی ٹپکنے لگی بلکہ شاید اُس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں، اس نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔

"آپ کو قطعی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں بس مجھے یہ یقین ہے اعتماد ہے، بھروسہ ہے کہ آپ میرا سوال ضرور پورا کر دیں گے۔ اللہ کے لیے مجھ پر رحم کیجیے، میری بات مان لیجیے۔ اچھا چلیے چائے تو پی لیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کنجوس نہیں ہیں آپ دوسروں کے دکھ درد کو جانتے ہیں آپ کا دل بڑا غنی ہے۔ آپ کو چھینک ضرور آئے گی، میری خاطر!"

"کیا واہیات بات کرتے ہیں۔ دماغ چل گیا ہے آپ کا۔ آپ کسی اور کو تلاش کیجیے، ہٹیے میرے راستے سے" میں نے جھلا کر آگے بڑھنا چاہا۔

لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھوڑی دیر بعد وہ اور میں ہوٹل میں بیٹھے چائے پی

رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھا، خوشی اس کے چہرے بشرے، نگاہوں بلکہ یوں کہیے اس کے بدن کے روئیں روئیں سے، اس کی داڑھی کے ایک ایک بال سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔ ہم بڑے دوستانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ ادبی موضوعات پر نہایت دانشورانہ گفت گو کر رہا تھا۔

خوف اور فکر کا جو موسم میرے ذہن سے ابھر کر میرے اعصاب پر چھا گیا تھا وہ اب بدل گیا تھا۔ میں اب، ادب، شعر، افسانہ، ناول اور تنقید کے موسم کو محسوس کر رہا تھا اور ہمارے چاروں طرف اسی کی فضا چھا گئی تھی۔

یکایک ایک اچھے موضوع پر بات کرتے ہوئے اس نے درمیان میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بڑے عجز سے کہا۔

"خدا کے لیے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ بس ایک ذرا آپ چھینک دیجیے، دیکھیے میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔" میں گھبرا کر اس کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگا اور یکایک غصے، بے چارگی، نفرت اور کراہیت کا موسم میرے ذہن سے اُبل کر میرے اعصاب پر چھا گیا اور میں اس سے کچھ کہے بغیر اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آ گیا کہ کہیں پھر اس کی آنکھوں کا سحر مجھے اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ کچھ دور چل کر میں بس اسٹاپ پر پہنچا اور کسی نہ کسی طرح ٹھس ٹھنسا کر بس میں سوار ہو گیا۔

جب بس ایک مشہور بس اسٹاپ پر پہنچی تو مجھے یاد آیا کہ واقعی مجھے آج شام ایک تنقیدی نشست کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔ اسی لیے میں دفتر سے خوش گوار موسم کا احساس لے کر روانہ ہوا تھا۔ کسی ادبی نشست کی صدارت کرنا کسی دفتر میں بڑا درجہ نہ رکھنے والے اور اپنے "باس" کی عنایت سے محروم، ہمیشہ غلط کام کرنے والے شخص کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ اسی لیے میں نے خوش گواری محسوس کی تھی۔ میں اسی لیے آج بہت خوش تھا۔ ایسے موسم کب آتے ہیں گھر جا کر روزمرہ کے

موسم کی کڑوی کسیلی اور جان و دل کو بھسم کر دینے والی گرمی کی ردا کو اوڑھے لیٹا پڑتا ہے۔ یہ ہم جیسوں کا روزمرہ جو ہوا۔

میں بس سے اتر کر جب ادبی نشست کے کمرے میں پہنچا تو ابھی اجلاس شروع نہیں ہوا تھا۔ مجھ کو نہایت احترام اور عزت کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا۔ نشست شروع ہوئی تو میری تعریف و توصیف کے بعد مجھے کرسئ صدارت پر بلایا گیا۔ کرسئ صدارت کے گداز نے بڑی طمانیت اور نشاطِ روح عطا کی۔ میں تو اس وقت اپنے "باس" کی غراہٹ سے دور اس کی کرسی سے زیادہ باوقار کرسی پر بیٹھا تھا۔

پہلے گزشتہ اجلاس کی کارروائی پڑھی گئی پھر ایک نظم اور افسانہ پیش ہوا۔ ان پر تنقید ہوئی اور جب میں اپنے فاضلانہ صدارتی کلمات ادا کر رہا تھا تو ....

" اُف خدایا یہ کہاں سے آن ٹپکا " وہی آل جہانی جارج پنجم کی شکل والا معصوم سرخ و سپید ہنستی آنکھوں والا چہرہ وہ تو کمرے کی آخری صف کی آخری کرسی پر براجمان ایک بوڑھے کے کاندھوں پر سجا ہوا تھا اور اس کی نگاہیں مجھ سے کہہ رہی تھیں۔

"خدا کے لیے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا بس اک ذرا چھینک مار دیجیے۔ شکریہ۔" اور نہ جانے کس طرح میرے نتھنوں میں چبھن در آئی اور میں کوشش کے باوجود اس کی درخواست رد نہ کر سکا اور چھینک نہایت زوردار اور پھر ایک اور ..... اور پھر ایک اور، اور ایسی کہ جن سے چھت اڑی جا رہی تھی!

میں مسلسل چھینکے جا رہا تھا۔ وہ میری فاضلانہ تقریر۔ " اف! یہ کیا ہوا یہ کون سا موسم چھا گیا۔"

اور وہ چہرہ! کاش اس دن اس چہرے پر جو سکون میں نے اپنی چھینکوں کے بعد دیکھا، وہ مجھے کبھی نصیب ہو جائے تو ... نہیں ... کاش ایسا ہو جائے!

مگر وہ چہرہ تو رنگ روپ بدل کر میرے "باس" کا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔"

(۱۹۸۰)

"ناخنِ گرہ کُشا"

یہ جو صوبائی اور ضلعی مقامات پر سرکاری افسروں کی رہائشی کالونیاں ہوتی ہیں، ان میں بھی وہی حفظِ مراتب ، چھوٹے سرکاری ملازموں کی بیویوں کو بڑے سرکاری افسروں کی بیویوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے، جیسا کہ ان کے شوہر اپنے دفاتر میں مدارج کے مطابق خیال رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان سرکاری افسروں کی کالونیوں میں بھی تین حلقے بن جاتے ہیں۔ ایک ذرا، اعلا درجے کے افسروں کی بیویوں کا، دوسرے اُن سے کم تر افسروں کی بیویوں کا اور تیسرا حلقہ ان کا کہ جن کے شوہر افسری کی منزل کی پہلی سیڑھی پر قدم جما رہے ہوتے ہیں۔

میں اپنے شوہر کے مرتبے کے مطابق دوسرے درجے کے حلقے میں شامل تھی، ہم عورتیں جب قریب تر رہنے والی عورتوں سے ملتیں تو گھریلو باتوں کے علاوہ، ایک دوسرے کے شوہروں اُن کے بچّوں اور اُن کے ساتھ رہنے والے بھائیوں اور بہنوں پر بھی تبصرے کرتیں، اور ان ہفتہ واری مجلسوں میں جو کسی کلب یا تنظیم کے تحت کھانے پینے اور گپ شپ کے لیے منعقد ہوتیں تو، اِن لڑکوں، لڑکیوں کے بارے میں بھی باتیں ہوتیں جن کی شادیاں نہیں ہوئی تھیں اور جو ابھی طالب علمانہ زندگی گزار رہے تھے انہی مجلسوں میں اس بات کی بھی ٹوہ لگائی جاتی کہ کون سا نیا آنے والا افسر ابھی چھڑا

ہے۔اور پھر جب اس کا پتہ چلتا تو ہم میں سے ہر ایک اپنی بیٹی، بہن، سالی یا کم سے کم اپنے قصبے اور شہر کی کسی لڑکی کے لیے اس پر ڈورے ڈالنے کی منصوبہ بندی شروع کر دیتی۔ بعض خواتین کے لیے تو یہ بہت ہی دلچسپ اور کل وقتی مشغلہ تھا۔

ایک دن میرے شوہر نے بتایا کہ ان کا ایک ساتھی افسر آیا ہے، بہت اچھا ہے، پڑھا لکھا بھی ہے اور شائستہ بھی اور ابھی تک کنوارا ہے اور پھر میں نے کسی دوسری ساتھی عورت کو پتہ دیئے بغیر اپنے میاں کی خوشامد کر کے دوسرے دن ہی اس کو کھانے پر بلالیا۔ میں اپنی ایک سہیلی کی بہن کے لیے ایک اچھے شوہر کی تلاش میں تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنی شادی کے دو سال کے اندر ہی اندر اپنی دونوں بہنوں کی شادیاں اسی طرح کرا چکے تھے ــــ لیکن بھائی دلدار علی نے تو پہلی ملاقات ہی پر صاف صاف اظہار کر دیا کہ وہ شادی کرنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ انھوں نے یہ بات میرے شوہر کے ایک سوال کے جواب میں، ڈنر کے بعد کافی پیتے ہوئے اس طرح دوٹوک انداز میں کہی کہ میری تمام ہمتیں جواب دے گیئں۔ مگر میں نے سوچا کہ:

"میں اپنی سہیلی کی بہن کے مسئلے پر نہ کوئی بات کر کے شکست اٹھانے کو تیار ہوں اور نہ ہی ایسی سبکی مجھ سے برداشت ہو گی کہ میں اپنی سہیلی کی بہن کو یہاں بلا کر ان سے ملواؤں اور وہ پھر انکار کر دیں۔ نہیں اس طرح نہیں، بھائی دلدار علی کو اس طرح آزاد بھی نہیں رہنے دینا ہے، یہ تو ہم عورتوں کی تذلیل ہے۔"

میں نے بہر حال جب زور دے کر ان سے اس کی وجہ معلوم کی اور ان کی پسند معلوم کرنی چاہی اور ان کی ان دیکھی محبوبہ کے بارے میں پتہ چلانا چاہا تو انھوں نے بڑے سیدھے سادھے غیر جذباتی انداز میں بس شادی نہ کرنے کے اپنے فیصلے پر اس طرح مہر ثبت کر دی جیسے کسی مقدمے کی فائل پر انھوں نے اپنا فیصلہ تحریر کر دیا ہو۔

میں نے بھائی دلدار علی کا مسئلہ اب اپنے حلقے کی عورتوں تک پہنچایا اور زور

دیا کہ ان کی شادی کرانے کی تدبیر اور منصوبہ بندی ہم سب کو کرنا چاہیے۔ ہمارے حلقے کی کئی عورتیں اپنی اپنی چہیتی لڑکیوں کے لیے کسی بر کی تلاش میں پہلے ہی مصروف تھیں، بھائی دلدار علی کی خوب دعوتیں ہوئیں۔ بات کالونی میں پھیلتی گئی اور ہر ایک خاتون اپنے اپنے طور پر منصوبہ بندیوں اور سازشوں میں لگ گئی۔

ایک دن میرے شوہر نے بتایا کہ بھائی دلدار علی نے کوئی محکمہ جاتی امتحان دیا تھا، جس کے باعث اب اُن کی نئی پوسٹنگ ہونے والی ہے اور وہ اب میرے شوہر سے اگلے گریڈ میں ترقّی بھی پا جائیں گے۔ مجھے اپنے نشانے کے بے کار جانے کا افسوس ہوا لیکن بھائی دلدار علی سے اس عرصے میں کچھ ایسے خوش گوار اور گھریلو تعلقات ہوگئے کہ اس بات کو سن کر خوشی بھی ہوئی۔

بھائی دلدار علی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ میرے شوہر کے ایک قابلِ اعتماد دوست اور ساتھی بن گئے تھے۔ وہ ایسی اچھّی اچھّی باتیں کرتے اور وہ لطیفے سناتے کہ دل خوش ہو جاتا، ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، وہ ہر موضوع پر بے تکان بات کرتے چلے جاتے تھے وہ ہماری مُنّی سے جو تین برس کی تھی بہت مانوس ہو گئے تھے یہاں جب وہ ہماری گفتگو سے بور ہو جاتے تو منّی کو لے کر ٹہلنے چلے جاتے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ ہم کو اگر کہیں باہر جانا ہوتا تو وہ مُنّی کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ہمارے گھر آجاتے مُنّی بھی اس قدر اُن سے ہل گئی تھی کہ وہ گھنٹوں اُن کے ساتھ رہ جاتی۔ وہ اس کے لیے کھلونے لاتے اور کبھی کبھار کپڑے بھی۔

چند ماہ کے بعد بھائی دلدار علی کا صدر مقام پر تبادلہ ہوگیا، ہمیں بہت افسوس ہوا، اور مُنّی بھی بہت پریشان ہوئی۔ جاتے وقت بھائی دلدار علی مُنّی سے جُدا ہوتے پر آبدیدہ ہوگئے۔

وہ ہفتہ وار چھٹّی پر اکثر صدر مقام سے ہمارے پاس وقت گزارنے کو آجاتے

اور سچ پوچھیے تو وہ ہمارے، پاس کیا آتے تھے ۔ وہ تو مُنّی سے ملنے آتے تھے اس کے کچھ عرصے بعد ہی میرے شوہر کا بھی صدر مقام پر تبادلہ ہوگیا اور بھائی دلدار علی نے تو اب جیسے ہمارے گھر پر ہی ڈیرے ڈال دیے، دفتر کا وقت اور رات گئے سونے کے لیے اپنے ہوسٹل جانے سے بچنے والا سارا وقت وہ ہمارے ساتھ ہی گزارتے اور رات کا کھانا روزانہ ہمارے ساتھ کھاتے ان میں اور مُنّی میں جو رفاقت اور محبت بڑھتی جارہی تھی اور جس طرح وہ اب مُنّی کا خیال رکھنے لگے تھے، اس سے اب مجھ کو ان سے کچھ چڑ سی ہونے لگی تھی۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھا "بھائی دلدار علی ۔ آپ کو بچّوں سے بڑی محبت اور پیار ہے ؟"

"نہیں بھابی ۔ بچّوں سے نہیں مُنّی سے کہیے ۔"

"آخر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے تاکہ آپ کو اپنی بچّی مل جائے ۔"

"بھابی ۔ یہ مُنّی کیا میری ہی بچّی کی طرح نہیں ہے ؟"

میں نے کہنا چاہا "پھر بھی ۔۔۔۔۔"

"پھر بھی کیا ۔ میں نے تو بہت مدّت پہلے آپ کو بتلا دیا تھا کہ میں شادی نہیں کروں گا ۔ اس پر میں اب تک قائم ہوں اور ہمیشہ رہوں گا ۔"

کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ معلوم ہوا کہ بھائی دلدار علی کسی سرکاری وفد کے ساتھ باہر جارہے ہیں ۔ جاتے وقت وہ مُنّی سے مل کر خوب روئے اور مُنّی بھی روتی رہی ۔ انھوں نے مُنّی کو دلاسہ دیا اور بتایا کہ وہ فلپائن جارہے ہیں وہاں بڑی خوب صورت گڑیاں ملتی ہیں، وہاں سے وہ اس کے لیے بولتی چالتی خوب صورت اور من موہنی گڑیا لائیں گے ۔ جس وفد کے ساتھ بھائی دلدار علی گئے تھے، وہ تو کوئی تین ماہ بعد واپس آگیا لیکن کوئی سرکاری چکّر چلا کر بھائی دلدار علی نے تین مہینے اور فلپائن میں رہنے کی اجازت حاصل کرلی ۔

بھائی دلدار علی کو گئے ہوئے کوئی پانچ مہینے ہونے کو آگئے تھے بڑی مشکل سے ہم نے منّی کو کچھ ادر باتوں میں بہلایا تھا اور اب اسکول میں داخل کرنے کا بھی زمانہ آرہا تھا اس لیے اس کی تعلیم پر بھی ہم نے توجہ دینی شروع کر دی تھی لیکن منّی تو اس بولتی گڑیا کے انتظار میں تھی جس کے لیے اس کے انکل دلدار علی اس سے وعدہ کر کے گئے تھے۔

ایک دن دفتر سے آکر میرے شوہر نے بتایا کہ بھائی دلدار علی کا تار آیا ہے وہ کل رات کی فلائٹ سے مع اپنی بیوی کے پہنچ رہے ہیں اور ہمارے گھر ہی ٹھہریں گے"۔

"کیا ؟ کیا ! کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ بھائی دلدار علی اپنی بیوی کے ساتھ ؟"

میرے شوہر نے کہا۔" ہاں ! تار میں انھوں نے یہی لکھا ہے"۔

میری تو رات کی نیند اڑ گئی، تمام دن میں کھوئی کھوئی رہی اور بھائی دلدار علی اور ان کی بیوی کے لیے کمرہ ٹھیک کرتی رہی۔ دن مشکل سے گزرا۔ ہم نے منّی کو بتایا کہ اس کے انکل آج رات اس کے لیے گڑیا لے کر آرہے ہیں"۔

ہم تینوں ایرپورٹ پہنچے اور بھائی دلدار علی، ایک خوب صورت رنگ رنگیلی شوخ آنکھوں، میٹھی مسکراہٹ والی خوش لباس فلیپینی دلہن لیے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئے وہ لڑکی ان کے ساتھ اس طرح لگ کر کھڑی ہوئی تھی کہ جیسے ان کے پیچھے چھپی جا رہی ہو۔ بھائی دلدار علی نے تعارف کروایا اور ان کی بیگم جس کا نام انھوں نے" جینا"، بتایا بڑی خوبصورت اور مشینی گڑیا کی طرح تھی اور جب منّی کو اس نے دیکھا تو اسے گود میں اٹھا کر ڈھیر سارے پیار کر ڈالے۔

بھائی دلدار علی نے منّی سے پوچھا" کہو گڑیا پسند آئی"۔ اور جینا جھینپ کر رہ گئی۔ ہم لوگ تمام راستے خاموش رہے، بس یونہی سی باتیں ہوئیں منّی جینا کے پاس ہی بیٹھی رہی گھر پر آکر میں نے جینا کو اس کے کمرے میں پہنچایا، منّی اس کے ساتھ ہی رہی اور میں نے کھانے کی میز لگا کر سب کو مطلع کیا کہ کھانا تیار ہے۔ بھائی دلدار

علی اور میرے شوہر باہر لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، وہ آگئے اور جینا اور مُنّی بھی! اُنھوں نے کہا کہ :

کھانا تو ہم جہاز پر کھا چکے تھے مگر اب یہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے ہمارے لیے بنایا ہے اور پھر جینا کے لیے تو یہ اس کے سسرال کا پہلا کھانا ہے اس لیے اس کو ضرور سُوارت کیا جائے گا۔ پھر دونوں نے مُنّی کے لیے وہ تحفے نکال کر دیئے جو وہ خلیا یٹن سے لائے تھے۔

چند روز کے بعد بھائی دلدار علی کو بنگلہ مل گیا۔ وہ چلے گئے مگر بھائی دلدار علی کے ساتھ جینا کا بھی مُنّی سے جو پیار نہ ہوا تھا، اس کی وجہ سے یا تو وہ دونوں ہماری طرف آجاتے یا ہم اُن کی طرف چلے جاتے۔

میں محسوس کر رہی تھی کہ جب سے جینا کو بھائی دلدار علی بیاہ کر لائے ہیں، میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھا ہوا ہے " یہ انھوں نے اپنے دیس اور اپنے ملک کی لڑکیوں کو چھوڑ کر، ملک سے باہر شادی کر کے ہم سب عورتوں کی توہین کی ہے؟" ایسا سوچ سوچ کر میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ مُنّی، جینا اور میرے شوہر باہر گئے ہوئے تھے کہ بھائی دلدار علی جینا کی تلاش میں ہمارے گھر آئے۔ میں نے رسمی تواضع کے بعد ان سے دو ٹوک الفاظ میں پوچھا۔

" بھائی دلدار علی آپ تو شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھے۔ پھر آپ نے شادی بھی کی تو ایک غیر ملکی خاتون سے۔ کیا ایسا کر کے آپ نے ہم ملکی عورتوں کی توہین نہیں کی ہے۔؟"

بھائی دلدار علی نے ایک طویل سانس لیا، پاؤں پھیلائے اور سر کو صوفے سے ٹکا کر آرام دہ پوزیشن میں بیٹھ گئے اور بولے۔

بھابی ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن میرے ساتھ ایک مسئلہ تھا جس نے مجھے ذہنی طور مفلوج کر رکھا تھا۔ آپ کو معلوم نہیں میں ایک چھوٹے سے دیہات کا رہنے والا ہوں، میں نے بڑی تکلیفوں میں زندگی گزاری ہے اور چھ سات سال کی عمر سے اس اذیت میں مبتلا رہا ہوں جو ایک ایسی رات میں مجھ پر نازل ہوئی تھی جب گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور دو دن سے موسلا دھار بارش نے تمام ندی نالوں کو اچھال کر رکھ دیا تھا یکایک ہمارے گوٹھ میں نہر کا بند ٹوٹنے سے پانی گھس آیا، اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔ مجھے اپنے ماں باپ کی چیخیں یاد ہیں اور یہ یاد ہے کہ میں نے اپنی چھوٹی بہن کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ ماں باپ کدھر بہہ گئے مجھے نہیں معلوم، میرے حواس جب ذرا درست ہوئے تو میں اپنی ننھی سی بہن کو اپنی گود میں لیے ایک چھوٹے سے مگر مضبوط درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا وہ رات ایک قیامت کی رات تھی اور مجھ پر اصل قیامت اس وقت ٹوٹی جب میں اپنی اونگھ سے بیدار ہوا تو میری بہن میری گود میں نہیں تھی۔ سیلاب اترا، مگر نہ کوئی اپنا تھا نہ پرایا۔ اتنا معلوم ہوا کہ میرے ماں باپ تو کہیں دور بہتے ہوئے چلے گئے تھے اور ان کی لاشیں تو ملی ہیں، مگر میری بہن کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ بہت سی باتیں تھیں۔ کوئی کہتا کہ اس کو مدد کو آئے ہوئے فوجی یونٹ نے بچا لیا ہے۔

بھابی! کیا آپ نے محض رسمی طور پر خاطر تواضع کو پوچھا تھا۔ آپ کافی نہیں پلوائیں گی؟"

قصے کا سرا یکایک ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے دلدار علی نے مجھ سے کہا اور میں کچھ دیر بعد اُن کے قصے کی طلسمی فضا سے کمرے کی فضا میں آئی اور بیلو کو کافی لانے کے لیے کہنے کو کچن تک گئی۔

کافی آ گئی۔ اور میں گم صم بیٹھی رہی، مجھ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ بھائی دلدار علی سے ان کی آپ بیتی کو آگے بڑھانے کا تقاضا کر سکوں۔ کافی کا ایک گھونٹ لینے کے بعد خود ہی بھائی دلدار علی نے قصے کو آگے بڑھایا۔

"کاش! بھابی کوئی مجھے یقین دلا دیتا کہ میری بہن بھی اس طوفان، سیلاب اور بارش میں ختم ہو چکی ہے لیکن ایسا نہ ہوا، اور میرے دل میں یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ میری بہن زندہ ہے۔ بہر حال میرے زخم بھر گئے اور میں اپنے گوٹھ کو چھوڑ کر قصبوں قصبوں، شہروں شہروں تعلیم کے لیے پھرنے لگا، مجھے اچھے لوگ ملے یہ دنیا ہمدرد لوگوں سے خالی نہیں، مجھے ایسے بھی لوگ ملے جنہوں نے میرے باپ کی زمین کو فروخت کر کے پورے پیسے میرے حساب میں جمع کرا دیئے اور میری اعلا تعلیم کا بندوبست کیا۔ بھابی کافی اچھی ہے۔ ذرا سی اس پیالی میں اور ڈالیے۔"

بھائی دلدار علی نے پھر مجھے قصّوں کی ابلتی فضاؤں سے صاف ستھرے اجالے میں کھینچ لیا۔ تازہ کافی کے دو گھونٹ لے کر بھائی دلدار علی نے پھر قصّے کے دھاگے سلجھانے شروع کیے۔

"جب میں یونی ورسٹی میں تھا تو مجھے ایک لڑکی سے پیار ہو گیا۔ میرا مستقبل شاندار تھا اس کے والدین مجھ سے اس کی شادی کر دیتے پر رضامند تھے لیکن اس لڑکی کے ساتھ جب کہ ایک دن میں تنہا تھا۔ مجھ پر ایک دم غشی طاری ہو گئی۔ مجھے طویل عرصے تک ہسپتال میں رہنا پڑا۔ اب یوں ہونے لگا کہ میں عورتوں سے گھبراتے اور خوف کھانے لگا بھاگنے لگا۔

..لونی ورسٹی کی اعلا تعلیم کے بعد میں، مقابلے کا امتحان دے کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا تو میرے ایک ساتھی نے جس کو میرا یہ حال معلوم تھا، اپنے والد سے اس کا ذکر کیا جو ماہر نفسیات تھے۔ انھوں نے مجھ سے گفتگو کی چند نشستوں کے بعد مجھے بتایا کہ "میرے ذہن میں یہ گرہ آپڑی ہے کہ میں اپنی کھوئی ہوئی بہن کو ابھی تک نہ صرف یہ کہ بھلا نہیں سکا بلکہ اپنے ماحول کی کسی بھی لڑکی کو جب میں اپنی شریک حیات کے طور پر چننا چاہتا ہوں تو مجھے اس کے روپ میں اپنی بہن نظر آتی ہے۔ تو بھابی۔ میں نے

شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"تو پھر یہ ـــ" میں نے غصّے سے کہنا چاہا۔ "آپ سنیے تو۔" بھائی دلدار علی نے مجھے ٹوکتے ہوئے اور میرے غصّے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

" فلپائن میں جب میں ایک اسٹور سے مُنّی کے لیے ہنستی بولتی گڑیا خریدنے کے لیے گڑیوں کو دیکھ بھال رہا تھا تو مجھے "جینا" ملی۔ لیکن پھر وہی سوال تھا کہ کیا میرا ذہن جینا کو بیوی کی حیثیت سے قبول کر لے گا؟ جینا سے ملاقاتیں ہوئیں تو ہم دونوں نے محسوس کیا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ہی تخلیق کیے گئے ہیں لیکن میں ہمیشہ اس سے بھری محفلوں، ہوٹلوں یا سیر گاہوں میں لوگوں سے کچھ الگ ہو کر بات کرتا مگر خوف کے مارے تنہا ملنے سے گریز کرتا۔ بہر حال میں نے کسی نہ کسی طرح اس کو اپنے اعتماد میں لے کر اصل حقیقت بتلائی تو اس نے مجھے وہاں کے اچھے نفسیاتی معالجوں سے ملوایا۔ اور ان کی طویل تحلیلِ نفسی کی نشستوں کے بعد بالآخر میرے ذہن نے جینا کو بحیثیت بیوی قبول کر لیا۔ اس لیے کہ وہ میرے ملک کے نقش و نگار، قد و قامت نہیں رکھتی تھی وہ تو بس "جینا" تھی۔ یہ بات میرے دل پر اثر کر گئی۔ تو اصل بات یہ ہے بھائی!"

اتنے میں جینا، میرے شوہر اور مُنّی بھی آ گئے۔ مجھے خاموش اور گم سُم دیکھ کر میرے شوہر نے بھائی دلدار علی کو مخاطب کر کے کہا۔

"تم نے شاید اپنی نفسیاتی گرہ والی بات بتا دی ہے۔" اس پر جینا بھی مسکرانے لگی اور میرے شوہر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "مجھے یہ بات پہلے ہی بتا چکے تھے۔ ان کی یہ نفسیاتی الجھن اسی طرح دور ہو سکتی تھی کہ یہ مُنّی کے لیے ایک خوب صورت اور چلتی پھرتی بولتی ہنستی اور قہقہے لگاتی گڑیا کسی غیر ملک سے لے آئیں اور اب یہ گڑیا لے آئے ہیں۔ اللہ کرے کہ جینا کی گود میں جلدی سے ایک آسمانی گڑیا اُتر آئے۔

اس پر جبینا شرم سے سرخ ہوگئی۔ کہ وہ تھی بھی مشرقی گڑیا !۔!!

میرے ذہن میں ایک خیال جھماکے کی صورت کوندگیا کہ جب ہم غیر محسوس طور پر اپنا کلاس تبدیل کر رہے ہوتے ہیں تو ہماری فکر توہمات کا بھی راستہ اختیار کر لیتی ہے اور ہمارا تعلیمی نظام ہم کو راہِ حقیقت سے بھٹکا کر اپنی قومی روایت سے دور بھی لے جاتا ہے۔ یہ بات کبھی کوئی لطیفہ سناتے ہوئے شاید بھائی دلدار علی نے ہی کہی تھی۔ شاید !!

(۱۹۸۵)

دشمن دوست

زوّار علی کو سب سے پہلے میں نے اپنے دفتر کے ٹائم آفس میں بحیثیت ٹائم کیپر کے دیکھا تھا۔ زوار علی سے پہلے جو ٹائم کیپر تھے وہ نہایت مشفق اور ملنسار تھے۔ وہ دیر سے آنے والوں کے ساتھ اس چھوٹ کے علاوہ جو کمپنی کی طرف سے کارکنوں کو ملی ہوئی تھی کوئی رعایت تو نہیں کرتے تھے، لیکن وہ کسی کے ساتھ نہ تو درشتی سے پیش آتے تھے اور نہ طعنوں تشنوں سے کام لیتے تھے، نہ کسی کی مجبوری کا مذاق اڑاتے تھے اور نہ اس کی شکایت اپنے سے اوپر والوں سے کرتے تھے بلکہ وہ وقت پر آنے کے لیے سمجھانے کے انداز میں گفت گو کرتے تھے اور اگر کسی کے دیر سے آنے پر اس کے کسی دکھ بیماری یا شدید مجبوری کا پتہ چلتا تو اس کی دل دہی بھی کرتے تھے اور روزمرہ کی دشواریوں پر قابو پانے کا حوصلہ پیدا کرنے کی تلقین بھی کرتے تھے۔ مجھے وہ پسند تھے۔ وہ عمر رسیدہ تھے، وہ شہر میں تنہا رہتے تھے، اُن کے دو لڑکے تھے جو، جوان ہو کر ملک سے باہر جا کر ملازم ہو گئے تھے، ان کی بیوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بڑے کم گو تھے میں نے بعض اوقات ان سے گفتگو کرتے ہوئے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بچّوں کے دور چلے جانے سے خوش نہیں وہ کبھی جھنجھٹ بھی نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ ٹائم آفس میں اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ نرم گفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ موجود ملتے تھے۔

ایک دن ٹائم آفس میں وہ نہیں تھے، دوسرے تیسرے دن پتہ چلا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ ان کے گھر کا پتہ معلوم کر کے ان کی تعزیت کو جاتا، لیکن جاتا تو کس کے پاس! پتہ چلا تھا کہ وہ جس کمرے میں رہتے تھے اس کے آس پاس رہنے والوں کو بھی اُن کی موت کے سولہ ۱۶ گھنٹے بعد معلوم ہوا کہ اندر اُن کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ سب کو اُن کے انتقال پر صدمہ ہوا۔

ان کی جگہ زوّار علی جو پرسونل آفس میں کسی کلریکل جاب پر لگے ہوئے تھے ٹائم آفس میں بہ حیثیت ٹائم کیپر کے بیٹھے نظر آئے، اُن کے طور اطوار اور لوگوں سے اُن کی روش کا جوں جوں پتہ چلتا گیا، زوّار علی سے سب جلتے چلے گئے اور ٹائم آفس کے سامنے سے گزرنے والے ہر شخص کے چہرے پر تناؤ اور کھچاؤ انہیں دیکھ کر پیدا ہو جاتا۔ زوّار علی وقت سے کچھ دیر بعد آنے والوں کے ساتھ نہایت درجہ اہانت آمیز سلوک کرتے اور عورتوں کی طرح فقرے بازی کرتے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرتے ان کی آنکھوں میں لوگوں کے لیے ایک نفرت موجود ہوتی اور اُن کے چہرے پر ہمیشہ ایک استہزائی مسکراہٹ کھنڈی رہتی۔ ان کا لب و لہجہ تو دُرشت تھا ہی لیکن ان کی آواز میں تلوار کی ایک شدید کاٹ تھی کہ جس کے کانوں سے ٹکراتے ہی پکے پھوڑے کے تپکنے کی سی جلن اور تکلیف سُننے والے کے تمام بدن میں تیر جاتی تھی۔

زوّار علی درمیانے قد و قامت کے دُبلے پتلے انسان تھے، ان کے نقش و نگار اچھے ہو سکتے تھے اگر ان کے چہرے اور گالوں پر کچھ گوشت کی بوٹی چڑھی ہوتی، وہ سانولے نہیں بلکہ کالے کلوٹے کے قریب تر رنگ والے تھے۔ غصے میں تو ان کی آنکھوں سے سانپ کی آنکھوں کی طرح کی خوف زدہ اور مسحور کر دینے والی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں، اُن کی لانبی اور اٹھی ہوئی ناک کے نیچے اُنھوں نے گھنی مونچھیں سجا رکھی تھیں لیکن چہرہ متناسب ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ وہ جب کبھی اپنے سے کسی چھوٹے رتبے والے سے بات کرتے تو اس

طرح کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ دیکھو سدھر جاؤ اور میرا رعب تسلیم کر لو ورنہ ایک دن یہ سب کس بل نکال کر رکھ دوں گا۔ وہ پان بکری کی طرح تو نہیں چباتے تھے لیکن اس طرح پان کھاتے رہتے تھے جیسے منہ میں آئس کریم کو رکھے ہوئے گھلا رہے ہوں۔ گالوں کی جھریاں اس وقت بڑا لطف دے جاتی تھیں جب وہ کسی کا مذاق اڑانے کے لیے اپنے چہرے کا حلیہ بگاڑ لیتے تھے۔ ان کی شخصیت ایک ایسے امرود کی طرح تھی کہ جو اوپر سے تو سبز ہو لیکن اندر سے سرخ ہو، وہ عام کارکنوں کے لیے تو زہر ہلاہل تھے مگر اپنے سے بڑے رتبے والے کارکنوں، افسروں کے لیے وہ ہمیشہ شربت الائچی بن جاتے کہ اس کو پی کر مزہ بھی آئے اور منہ میں خوشبو بھی بس جائے۔ افسروں اور اعلا سطح کے لوگوں میں ان کو بہت سی ایسی خوبیاں نظر آجاتی تھیں کہ جن کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا تھا اور وہ عورتوں کے سے انداز میں بڑے نخروں کے ساتھ ان کی تعریف و توصیف الفاظ چبا چبا کر کرتے تھے۔ جب زوار علی کو میں نے ٹائم آفس میں دیکھا، وہ مجھے ان تمام باتوں کی وجہ سے جن کا میں نے جائزہ لیا قطعی پسند نہیں آئے اور شاید نہ میں ان کو پسند آیا۔ ان کو میرا محتاط رویہ، میری کم سخنی، اپنی ذات کو اپنی ذات" تک محدود رکھنے کا انداز اور ان کو نظر انداز کرتے رہنے کی میری کوشش نے ان کو تلملا کر رکھ دیا۔ میرے اور ان کے تعلقات دل ہی دل میں خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کی طرف خوش مزاجی سے دیکھ لیتے تھے، لیکن وہ جو انسان کی ایک خفتہ حس ہوتی ہے اس نے دونوں کو باخبر کر دیا تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ کم سے کم میں نے پہلے دن سے ہی ان کو اپنا دشمن سمجھ لیا تھا۔ اپنی چاپلوسی سے زوار علی ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے پرسونل آفس میں ایک ذرا با اختیار رتبے پر جا پہنچے۔ مجھے ان کا یہ رتبہ، اثر و رسوخ اور ترقی و اختیار بالکل نہ بھلائے مگر کیا کر سکتا تھا۔ میری ڈور بھی انہی کے ہاتھوں ہوتی ہوئی افسرانِ اعلا تک پہنچتی تھی۔ میری گردن میں پڑی ڈور کو وہ جب بھی ہلاتے میرا رواں رواں

جھنجھنا اٹھتا، مگر صبر کے علاوہ چارہ نہیں تھا! میں جہاں تھا وہیں رہ گیا اور وہ اعلا افسروں کی ناک کا بال بن گئے۔ اور زیادہ با اختیار ہو گئے، اور وہ ان اختیارات کو کارکنوں کو ذلیل کرتے اور اپنی دبی ہوئی شخصیت کو منواتے کے لیے استعمال کرتے۔ اکثر میں اُن کے بارے میں سوچتا کہ اُن کے اِس مردانہ جسم میں کس بساندھی بوڑھی عورت کی روح آبسی ہے۔ جو وہ لوگوں سے جلنے ان کو نیچا دکھلاتے اور اپنا آپ منواتے کے لیے رکیک حرکات کرتے رہتے ہیں۔ اُن کا چیزوں کو سینت سینت کر رکھنا اور لپٹے کپڑوں اور سر پر منڈھی ہوئی ٹوپی کا خاص خیال رکھنا، خوشبو دار پان کھاکر ہونٹوں پر لاکھا جمائے رکھنا انگلیوں میں انگوٹھیوں کو ٹھونسے رکھنا، اور ہر ایسی ادا اختیار کرنا کہ ہر شخص کو اُن کے ہونے کا احساس ہوتا رہے، یہ سب باتیں ایسی بوڑھی عورتوں کی سی تھیں جو اپنے جوانی کا نوحہ اور گھُلتے ہوئے جسم کو بچائے رکھنے کا مرثیہ پڑھتی رہتی ہیں۔

رخشِ وقت کے سموں سے اٹھنے والی دھول نے بہت کچھ درمیان میں دھندلا ڈالا۔ مجھے تو ان کا چہرہ اور طور طریقے اس طرح یاد رہے کہ تو بہ ہی بھلی نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے اور یہ کون سی نفسیاتی گتھی ہے جو ہمارے ذہن و دماغ کو کسی ایک شخص کو خواہ مخواہ اپنا دشمن سمجھ لیتی ہے اور محبت و تلطف کی جگہ نفرت اور غصے کو بڑھاتی چلی جاتی ہے، اُس شخصیت سے دور بھی ہو جاؤ تو وہ شخصیت اسی روپ میں ذہن پر سوار رہتی ہے جس روپ میں اس کا بت ذہن میں نفسیاتی الجھن نے تراش چھوڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح زوّار علی میرے ذہن اور دماغ پر چپک کر رہ گئے تھے۔

مجھے زوّار علی سے پہلے ریٹائر ہو جانا تھا سو ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ریٹائر ہوتے پر میرے دفتری دوستوں نے ایک الوداعی دعوت دی تھی اس میں زوّار علی نے بھی شرکت کی تھی اور میری بہت سی ایسی خوبیوں کا ذکر کیا تھا، جو میں نے اپنے آپ میں کبھی نہ پائی تھیں، زوّار علی نے میرے حلم، بردباری، اخلاص اور دوستانہ روش کا اپنی تقریر میں شاندار انداز

میں ذکر کیا، اور رخصت کے وقت دوسروں کے مقابلے میں مجھے نہایت گرم جوشی سے سینے سے لگایا، میرے لیے کلماتِ خیر کہے اور اس دوستی کو جو میرے اُن کے درمیان کبھی نہ تھی جاری رکھنے پر زور دیا۔

میں شاید پہلے ہی کچھ بے زار سا تھا، ریٹائر ہو کر تو کچھ عجیب سا حال ہوا، ریٹائر ہو کر انسان کچھ عجیب سا جانور ہو کر رہ جاتا ہے کہ جس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بالکل اس طرح جیسے جب رکشائیں چلنے لگیں تو تانگے ختم ہو گئے اور ان کے گھوڑے بے مصرف۔ میں نے کئی ایسے گھوڑوں کو دیکھا ہے جو بوڑھے ہو کر بھوکے پیاسے چھوڑ دیے گئے تھے اور جو لنگڑاتے ہوئے سڑک کوچے کوچے گھومتے رہتے اور بھوک ان پر سوار ہو کر اُن کے سب کس بل نکال کر انہیں کہیں کونے کھدرے میں گر پڑنے پر مجبور کر دیتی اور پھر وہاں پاؤں ٹیک ٹیک کر مر جاتے۔

میرے ساتھ خیر ایسا تو نہیں ہوا، میں اپنی بیوی کی موت میت سے تو پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے میرے ذہن پر تنہائی کا بڑا خوف طاری ہو گیا تھا مگر میرے دونوں بیٹے خاصے سعادت مند نکلے تھے اور مجھ سے کہیں زیادہ اعلا تعلیم پاکر بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ بڑے بیٹے کو اچھا مکان ملا ہوا تھا اس کی شادی ہو چکی تھی وہاں مجھے بھی ایک اچھا آرام دہ کمرہ دے دیا گیا۔ بہو، میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ البتہ مجھے اس وقت بڑا ہی ہول اُٹھتا تھا، جب وہ چھٹی کے دن شام کو تینوں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ میرا زیادہ وقت بنگلے کے سبزہ زار پر کرسی پر بیٹھے اونگھتے ہوئے گزرتا یا پھر سوتے جاگتے کی سی حالت میں ٹی وی دیکھتا رہتا۔ اس تنہائی اس ہول اور خوف کے ماحول میں اکثر زوّار علی کا چہرہ اُبھرتا اور میرا مذاق اڑاتا رہتا۔ عجیب عجیب شکلیں بنا کر ان کا چہرہ میرا منہ چڑاتا رہتا اور جس قدر میں اس تصور سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا وہ اسی قدر تندی اور تیزی سے ذہن پر سوار ہوتا چلا جاتا۔ بعض اوقات تو میں سوچتا کہ شاید موت ایسی ہی صورت

میں مجھ پر وارد ہوگی جیسی شکل و صورت نزوار علی کی ہے۔ اللہ کی پناہ میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔

ایک شام بڑی خوش گوار تھی شاید میں کئی دنوں سے تنہا نہیں رہا تھا، میری بہو میری دلجوئی کر رہی تھی اور میرے مرغوب کھانے بھی مجھے مل رہے تھے، میرے بیٹے بھی اکثر میرے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ تو اس خوشگوار شام کو تھوڑا سا حبس تو تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ طبیعت کو پژمردہ کر دے۔ میری بہو خاموشی سے میرے پاس آکر لان میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی، اور میری مزاج پرسی کے بعد بولی کہ "آپ کے لیے چا اور پکوڑے بنا کر لاؤں؟ پکوڑے میرے دل پسند پکوانوں میں سر فہرست تھے۔ چائے بھی آئی اور پکوڑے بھی اور جب میں اس لذتِ کام و دہن سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ میری بہو مجھ سے کوئی بات کہنے کے لیے پر تول رہی ہے۔

مجھے کئی دن سے یہ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ اب ان سب کو مجھے اپنے ساتھ رکھنا کچھ کھلنے لگا ہے۔ کئی دن سے وہ تینوں دھیمے لہجوں میں ادھر ادھر کبھی اپنے کمروں کے دوازے کے سامنے، کبھی برآمدے میں اور کبھی صحن میں کوئی مسکوٹ سی کرتے نظر آتے۔ تو میں نے جو اپنی بہو کو بات کرنے کے لیے پر تولتے دیکھا تو سوچا۔ چلو جو بات کل ہونی ہے وہ ابھی ہو جائے تو کیا برا ہے میں نے بہو کی طرف نظر اٹھا کر پوچھا "کیا بات ہے بہو؟"

اس نے اپنے دوپٹے کا پلو انگلیوں میں مروڑتے ہوئے نگاہیں نیچے کر کے کہا۔ "آپ سے ایک اہم بات کرنا ہے، نعیم میاں کے بارے میں" نعیم میرے چھوٹے لڑکے کا نام ہے۔

"کیا ہوا نعیم کو؟" میں نے بہو سے پوچھا میرے لہجے میں اطمینان تھا، جس بات کا مجھے خطرہ تھا وہ بات نہیں تھی۔

"وہ نعیم میاں شادی کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے لڑکی پسند کر لی ہے، آپ لڑکی

والوں سے ملاقات کر لیجیے اور اگر یہ رشتہ آپ کو پسند ہو تو بات بھی پکی کر لیجیے۔"

"کون ہیں وہ لوگ؟" میں نے پوچھا

"وہ لڑکی کا بھائی نعیم میاں کے ساتھ پڑھتا تھا۔ اب وہ امریکہ میں رہتا ہے۔ آج کل آیا ہوا ہے، وہ شادی کے بعد اپنی بہن کے ہمراہ نعیم میاں کو بھی امریکہ لے جانا چاہتا ہے، اور نعیم میاں کی بھی ایسی ہی خواہش ہے وہاں اُن کو یہاں سے اچھی ملازمت مل جائے گی۔ وہ اچھے لوگ ہیں آپ مل کر تو دیکھیے۔ لڑکی کی ماں تو ہے نہیں اس کے والد بہت پیارے ہیں اور بہت گرہست مرد ہیں۔ انھوں نے اپنی بیٹی کے لیے اپنے ہاتھوں سے تمام شادی کے کپڑے سیے ہیں اور جہیز تیار کیا ہے۔"

بہو کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ چپکے سے دونوں بھائی بھی دبے پاؤں آکر خالی پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"اچھا تو کب چلنا ہے؟" میں نے چھوٹے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"کل ہی چلیے۔" چھوٹے کے بجائے بڑے لڑکے نے جواب دیا دوسرے دن شام کو جب ہم لوگ شہر کے سب سے فیشن ایبل علاقے میں پہنچے تو جہاں بڑے صاحبزادے نے گاڑی جا کر روکی تو وہ ایک بہت بڑی کشادہ ماڈرن بنی ہوئی کوٹھی کا گیٹ تھا۔ اس گیٹ کے بازو میں سنگ مرمر کی تختی پر میری نظر پڑی جس پر "منزل زوار" لکھا تھا تو مجھے یکایک بخار چڑھتا ہوا محسوس ہوا اور گیٹ کھلنے پر جب ہماری گاڑی پورٹیکو میں پہنچی اور ہم اترے تو سامنے ہی زوار علی کھڑے تھے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بس ان کے بال سفید ہو گئے تھے اور چہرے اور گالوں پر جھریاں زیادہ ہو گئی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر پان کا لاکھا نہیں تھا کہ اب شاید انھوں نے پان کھانا چھوڑ دیا تھا مگر اُن کے ہونٹوں پر وہی بد ذات مخصوص استہزائی مسکراہٹ موجود تھی جیسے ٹائم آفس میں تاخیر سے پہنچنے والے کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر بکھر جاتی تھی۔ مجھے اس وقت اُن

کے وہ تمام انتباہی نوٹس یاد آگئے جو وہ میرے تاخیر سے آنے پر پرسونل آفس سے ہر ماہ بلیک وارنٹ کی صورت میں جاری کرایا کرتے تھے۔ یکایک زوّار علی نے بڑھ کر مجھے گلے لگالیا۔" ارے تم! آج بھی تم دیر سے آئے ہو۔ صاحبزادے نے تو گھنٹہ بھر پہلے پہنچ جانے کو کہا تھا۔" پھر میرے بچوں اور بہو سے مخاطب ہوکر بولے" ارے بھائی ہم تو ایک دوسرے کے نہایت گہرے دوست رہے ہیں کیا شان ہے اللہ کی۔" پھر میری طرف مڑتے ہوئے میرا بازو تھام کر بولے۔

" ارے میاں تم اتنے دن کہاں غائب رہے۔ یار تم سے پہلے ہی گہرا رشتہ تھا اور اب یہ رشتہ تو آسمانوں پر طے ہوجانے والا رشتہ ہے۔ آؤ، آؤ اندر آؤ۔ اس مسئلے پر اب کیا بات کرنا ہے بس ہوا سمجھو" میں سب کے ساتھ بادل نخواستہ اندر پہنچا۔ زوار علی کی لڑکی بڑی خوب صورت تھی شرمیلی بھولی بھالی سی۔ اور ان کا لڑکا بھی ان سے بہت مختلف تھا خوب صورت جوان رعنا۔ گورا چٹا۔"

" تو زوّار علی تم بیٹی کے ساتھ داماد کو بھی لے کر اپنے بیٹے کے ہمراہ امریکہ چلے جاؤ گے؟" میں نے پوچھا اپنی مخصوص کھڑکھڑاتی اور سماعت کے پردوں پر پکے پھوڑوں کی ٹیک پیدا کردینے والی مخصوص قہقہہ لگاتی آواز میں زوّار علی نے کہا۔" ارے میاں۔ میں اب کہاں جاؤں گا۔ اب تو میں اور تم دونوں یہیں رہیں گے۔"

میں نے سوچا یہاں سے بھاگ جاؤں، اور اپنے لڑکے سے اس رشتہ کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کردوں مگر مجھے بے یارو مددگار پھرتے والے وہ لنگڑے گھوڑے یاد آگئے جو سڑکوں سڑکوں بھوکے پیاسے مارے پھرتے ہیں اور بالآخر کہیں کونے کھدرے میں جان دینے کو پڑے رہتے ہیں اور ساتھ ہی مجھے زوّار علی سے پہلے والے ضعیف اور بے آسرا اٹامک کیپر کی کسمپرسی کی موت کے واقعے نے آدبوچا۔

میں نے جی میں سوچا" ہم مرتے وقت کم سے کم دو تو یہاں ہوں گے۔"

اس شادی کے کچھ عرصہ بعد جب میرا چھوٹا بیٹا زوّار علی کی بیٹی کے ہمراہ امریکہ چلا گیا اور میرے بڑے بیٹے کا تبادلہ ایک دوسرے شہر میں ہوگیا اور میرا بُک کرایا ہوا فلیٹ تیار ہو کر مجھے مل گیا اور "زوّار منزل" کرائے پر دے دی گئی تو زوّار علی اور میں فلیٹ میں اُٹھ آئے۔

زوّار علی میری بڑی خاطر داری کرتے میرے کپڑے دھوتے، جوتوں پر پالش کرتے، مزے مزے کے کھانے پکاتے اور پھر ہم دونوں مل کر شطرنج کھیلتے، ٹی وی دیکھتے اور اکثر و بیشتر وی سی آر پر دن رات فلموں کا سلسلہ چلتا رہتا۔

بس زوّار علی کو ایک تو میرے صبح دیر سے اٹھنے کی شکایت تھی اور دوسرے اپنے کپڑوں کے بٹن خود نہ ٹانکنے کی۔ وہ ان باتوں پر بہت جھلّاتے بُرا بھلا کہتے اور بعض اوقات تو بات چیت بند کر دیتے اور پھر اپنے غصّے کا اظہار اپنے گزرے زمانے کی طرح دفتری پرچوں کی صورت میں لکھ کر کرتے اور اگر اس پر بھی میں ان کے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا تو وہ ہتھیار ڈال دیتے اور مجھے منانے کے لیے میرے لیے اچھی چائے بناتے پکوڑے بناتے مجھ سے بہانوں بہانوں سے بات کرتے اور پھر خوشامد پر اتر آتے اور تمام خوبیوں کا ذکر شروع کر دیتے جو مجھ میں نہ کبھی تھیں اور نہ ہو سکتی تھیں۔

اور پھر ایسا بھی ہوتا کہ میں ناکارہ گھوڑوں کی کسمپرسی کی موت کے خوف سے نڈھال ہو کر اُن کی باتوں پر عمل شروع کر دیتا۔ تلطّف اور دوستی کا برتاؤ کرتا، دل میں شرمندہ ہوتا کہ زوّار علی کس قدر دشمن دوست انسان ہیں اور پھر بالآخر انھوں نے مجھے نہایت سلیقے سے نہ صرف بٹن ٹانکنا سکھلا دیے بلکہ سلائی اور تُرپائی بھی سکھلا دی۔

اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ میں نے اپنی سلائی کا درست اور کامیاب امتحان ان کا کفن سی کر دیا۔ !!

(۱۹۸۷)

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger
دھوپ ماند پڑ چکی تھی سائے ایک سمت میں سمٹنے لگے تھے، کبھی کبھار ایک آدھ خوش گوار ہوا کا جھونکا بھی بدن سے مس ہو رہا تھا۔ وہ سُست چال سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اِس وقت اُس کے ذہن و دماغ میں اپنے ٹھکانے کی کوئی یاد نہیں تھی، اُس مکان کی یاد جس میں وہ اپنے کنبے کے ساتھ کرایہ پر رہتا تھا۔ اس وقت تو ڈوبتے سورج کی طرح اُس کا ذہن بھی ماضی کی اُس یاد میں ڈوبتا جا رہا تھا جس کا تعلق اُس کی نوجوانی کے دور سے مانوس گاؤں کی فضا سے تھا۔

جہاں وہ تصوّر کی گود میں چلتے چلتے جا پہنچا تھا" ہرے ہرے لہلہاتے کھیت، اپنائیت اور رچاؤ کی فضا۔ ڈھور ڈنگر ڈھلتی دھوپ میں گھروں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اُن کے قدموں سے اُٹھنے والی دھول خاک سے نہ اُس کا سانس گھٹ رہا تھا اور نہ کوئی ناگواری محسوس ہو رہی تھی بلکہ ہوا میں ایک طراوت سی تھی۔ ڈھور ڈنگروں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آوازیں کتنی راحت فضا تھیں۔ اِن راستوں کے عادی اور ماہر اُس کے قدم کوئی ٹھوکر کھائے بغیر اُٹھتے چلے جا رہے تھے۔ دور کہیں چُنری جیسے رنگ بھی اُبھر اور ڈوب رہے تھے، گاؤں کے قریب تر ہوتے ہوئے کتنا اچھا لگتا ہے گویا کوئی آغوشِ وا کیے ہوئے، سینے سے لگا لینے اور پیشانی چومنے کو

منتظر ہوا! پگڈنڈی کے آس پاس چھوٹی جھاڑیوں یا بڑے پیڑوں پر چڑیاں بسیرا کرنے کے لیے چہچہا رہی تھیں۔

ایک دن اور گزرا کتنی مسرت ہے اِن چڑیوں کی آوازیں! دن چین سے گزر چلے تو رب کا شکر ادا کرتے ہوئے کتنی مسرت ہوتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کا سینہ ایک عجیب مسرت سے اُبھرتا اور ڈوبتا جا رہا تھا۔ ایک دن اور گزر گیا تھا کیوں گزر گیا تھا؟ یہ دن ہم سب کو کدھر لے جا رہے ہیں! ہم گزرتے دنوں کے ساتھ کیا کسی اختتامی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں! یا وہاں سے کوئی اور دن طلوع ہوگا؟ یا وہاں کچھ نہ ہوگا، ہمارے قدم وہاں رک جائیں گے!!"

"دیکھیے! یہ رستہ کدھر جاتا ہے؟" کسی نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس رستے کے بارے میں اُس سے پوچھا تھا جس سے وہ گزر رہا تھا۔

اس نے بائیں طرف نظریں گھمائیں۔ کوئی اجنبی شخص تھا لیکن اب نہ وہ ہرے بھرے کھیت رہے تھے کہ جن کے درمیان سے گزرنے والی پگڈنڈی سے وہ گزر رہا تھا، نہ گاؤں کی بو باس تھی نہ کہیں چُنری تھی نہ آغوش کے کہیں وا ہونے کا احساس نہ پیشانی پر بوسے کی گرمی کی تڑپ!

یہ تو وہ سڑک تھی جس سے گزر کر وہ روزانہ شام کو اپنے شہر کے مکان کو جایا کرتا تھا۔ وہ پہلے بس سے بڑی سڑک تک آتا اور پھر اس نواحی بستی کی اس سڑک پر پیدل چلتے ہوئے ایسے ہی کھو جاتا اور مکان پر پہنچنے کے بجائے پہلے وہ "اپنے گھر" پہنچنے کے احساس میں ڈوبا گزرا چلا جاتا، قدم اُس کے مکان کی طرف اس کے بوجھل اور بوڑھے جسم کو گھسیٹتے رہتے اور اس کا ذہن، اُس کا تصور اپنے گھر کے اطراف میں پائی جانے والی خوشبو کے احساس سے مہکتا رہتا۔

"دیکھیے! یہ رستہ کدھر جاتا ہے؟" اس سے کسی نے پھر بڑی اپنائیت سے پوچھا

اس کے ذہن و دماغ ماضی کے دھندلکوں میں ڈوبی ہوئی دنیا سے حال میں لوٹ آئے تھے اور اب وہ اپنے گھر کے راستے سے پھر مکان تک جانے والی سڑک پر رواں تھا۔ اس کے بدن پر اس کا روزمرہ کا لباس تھا، بوسیدہ جوتے پاؤں میں تھے۔ پنڈلیوں میں تھکن تھی منہ پر گزرے ہوئے برسوں کی دھوپ کی دھول بیٹھی ہوئی تھی کیسی کا، اس طرح اس سے کچھ پوچھنے کے لیے اس کو یوں ماضی کے خوابوں کی وادیٔ گل سے کھینچ کر حال کے ریگ زاروں کی طرف لاڈالنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ شہر تھا اور وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ دوسرے راہ گیروں کا اس پر کچھ حق تھا، اس لیے اس نے اپنی ناشگفتگی کا اظہار نہیں کیا۔

اس نے، اپنے ساتھ چلنے والے اس راہ گیر کو دیکھا وہ اس علاقے کا نہیں تھا، اس کی آنکھیں اس کی آنکھوں کی طرح گدلی نہیں تھیں، اس راہ گیر کی آنکھوں میں امید کے چراغوں کی لو تھی، طمانیت اور وفورِ تشکر کی چمک اور چہرے پر اس کی سرخی اور تپش تھی دھوپ ماند پڑ گئی تھی اور اب سائے سمٹ رہے تھے۔

"جی یہ سڑک کدھر جاتی ہے؟" اس راہ گیر نے اس کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اس سے پھر پوچھا۔

"یہ ادھر ہی جاتی ہے سامنے کی طرف۔ جدھر ہم جا رہے ہیں۔" اس نے راہ گیر اجنبی کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر سامنے سڑک پر آنکھیں جماتے ہوئے جواب دیا۔

"ادھر سامنے کہاں؟" اجنبی نے کچھ تعجب سے پوچھا!

"دیکھیے یہ صبح کے وقت ادھر جاتی ہے جدھر سے ہم آ رہے ہیں اور شام کو ادھر جاتی ہے جدھر ہم جا رہے ہیں۔" اس نے جھنجلا کر اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ سڑک آتی بھی ہے اور جاتی بھی ہے!" اجنبی نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ یہ سڑک تو یہیں پڑی رہتی ہے، یہ پتھروں کنکریٹ اور دوسرے ریت مٹی کی بنی ہوئی ہے، یہ کیسے حرکت کر سکتی اور ہم جو متحرک ہیں، سانس لیتے ہیں اور زندہ ہیں اس پر چلتے ہیں (ہمارا دماغ زمانے کے غموں اور فکروں کا بوجھ اٹھاتا ہے اور ہمارے جسم کا بوجھ ہمارے پاؤں برداشت کرتے ہیں اور ہمارے پاؤں کے بوجھ کو یہ برداشت کرتی ہے۔ یہ اس کا مقدر ہے)۔ جملہ کا آخری حصہ اس نے دل میں کہا۔

"میں آپ کا مقصد نہیں سمجھا۔" اجنبی نے کچھ تعجب سے گھبرا کر دریافت کیا۔

"اور اگر میں کہوں کہ میں آپ کے مطلب کو نہیں سمجھا تو؟" اس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"آپ بُرا مان گئے! ۔ دیکھیے مجھے اس سڑک پر ایک مکان پر جانا ہے۔ میں نے اس خوف سے یہ بات آپ کے مبہم جوابات پا کر پوچھی تھی کہ اس سڑک کے درمیان سے کئی سڑکیں یعنی چھوٹی چھوٹی سڑکیں دائیں کو بھی پھوٹتی ہیں اور بائیں کو بھی اور مجھے سیدھا اس طرف جانا ہے جدھر اس سڑک کو جا کر ختم ہو جانا ہے۔" اجنبی نے خود رک کر اور اس کو بھی روک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بڑی تفصیل سے اپنا مطب سمجھاتے ہوئے اس سے کہا۔

"دیکھو بھائی! جہاں ہمارے قدم رک جاتے ہیں سڑک وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ دیکھو نا! اب ہم اور تم یہاں رک گئے تو یہ سڑک ہمارے لیے تو یہیں ختم ہو گئی نا۔" اس نے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے بڑی رسانیت سے اس کو جواب دیا۔ حالاں کہ اب اس کا پارہ چڑھنے لگا تھا وہ اس طرح، مکان کی طرف جاتے ہوئے کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا تھا۔

اجنبی نے اس سے مزید کوئی بات کہنے کے بجائے ایک طویل سانس لی اور اس نے محسوس کیا کہ اجنبی شخص کی اس کے جواب سے کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے آہستہ سے اجنبی کے کندھے کو چھوتے ہوئے اپنے جواب کو آگے بڑھایا۔

"برسوں بیت گئے میں اس سڑک سے آشنا نہیں ہو پایا، مجھے تو اس کے اِدھر یا اُدھر مڑنے کا بھی کوئی احساس اور خیال نہیں ہوا، میرے قدم جس پگڈنڈی جس فضا، جس بستی اور اس میں رہ جانے والے اپنے گھر کے راستے سے آشنا تھے میں تو ان کو دل میں چھپا کر رکھے جانے والے راز کی مانند سینے کی گہرائی میں محفوظ کر کے بدلتے زمانے اور ترقی کرتی دنیا کے ہنرمندوں کے بنائے ہوئے کھلونوں کی طرح بس اپنی ضرورت کے تحت مجبور ہو کر آتا جاتا، اٹھتا، بیٹھتا اور کام کرتا رہتا ہوں۔"

بات کرتے کرتے یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ خواہ مخواہ غیر ضروری باتوں کا اظہار اجنبی راہ گیر سے کئے جا رہا ہے، اس نے اپنا جملہ بیچ ہی سے توڑ کر کہا۔

"معاف کیجیے میرا مقصد یہ ہے کہ میں یہاں جس مکان میں رہتا ہوں بس وہاں تک یہ سڑک مجھے یاد ہے، یا پھر وہ سامنے والی مسجد کے پیچھے وہ بڑی سڑک پر جو جنوب سے شمال کو جاتی ہے اور قبرستان پر جا کر ختم ہو جاتی ہے اس سے واقف ہوں۔"

"آپ اور ہم کچھ تھک گئے ہیں، موسم بھی آج کچھ زیادہ ہی گرم ہے، دیکھیے کس قدر پسینہ آ رہا ہے۔ آئیے، وہ جو سامنے ہوٹل سا ہے، وہ جہاں چند اسٹول اور میزیں پڑی ہیں، وہاں چل کر کوئی ٹھنڈا شربت پیتے ہیں۔ بلکہ شربت کیا؟۔ آئس کریم کھاتے ہیں ایسے شدید موسم میں آئس کریم بہت بہتر ہوتا ہے۔" اجنبی نے نہایت دوستانہ رویّہ اختیار کرتے ہوئے اس کو دعوت دی۔

"جی نہیں میں نہ کوئی شربت پیتا ہوں اور نہ ہی آئس کریم کھاتا ہوں۔ اس لیے کہ میں کسی کو کوئی شربت پلا سکتا ہوں اور نہ آئس کریم کھلا سکتا ہوں۔"

اس کو پھر یکایک احساس ہوا کہ اُس نے اجنبی راہ گیر کو اپنی ایک بڑی کمزوری سے خواہ مخواہ آگاہ کر دیا ہے۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔" اس نے جانے کے لیے اپنا رُخ بدلا۔

"آئیے۔ آئیے آپ میرے ساتھ تو آئیے۔" اجنبی نے اس کا بازو تھام کر اس پر

زور دیا۔

"جی نہیں میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ آپ مجھے جانے دیں۔" اس نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا۔

"کیا آپ اس گرمی اور پسینہ سے شرابور ہونے کے باوجود محض ٹھنڈا پانی پینا بھی پسند نہیں کریں گے؟ آیئے نا" اجنبی نے کسی قدر لجاجت سے اس سے پھر درخواست کی اور وہ اس کے ساتھ ہوٹل کے بینچ پر جا بیٹھا۔ اجنبی نے اپنے لیے آئس کریم اور اس کے لئے سادہ ٹھنڈا پانی منگوایا۔ ٹھنڈے پانی کے چند گھونٹ لے کر اس نے اپنا حلق تر کرنے کے بعد اجنبی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا "آپ کو اس سڑک پر جانا کہاں ہے؟ کس کے پاس جانا ہے اور مکان کا نمبر کیا ہے؟" یہ سوال اس نے اجنبی سے ملاقات کے بعد نہایت شائستہ اور دوستانہ لہجے میں پہلی مرتبہ پوچھا۔

"مجھے بس یہ مسجد کے قریب تک جانا ہوگا، وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے اطہر، اس کے مکان کا نمبر شاید ۲۱۲ ہے۔ ۲۱۲۔ ایل" اجنبی نے آئس کریم کے ذرّوں کو زبان سے منہ میں گھماتے ہوئے جواب دیا۔

"اطہر کے پاس۔ ۲۱۲۔ ایل میں!" وہ چونک پڑا، اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی سے نصف بھرا ہوا گلاس تھرتھرانے لگا، اور اس کے چہرے کی دھوپ کھائی ہوئی جھرّیاں بھی اس سوال کے ساتھ تھرتھرا اٹھیں، اس کی آنکھیں اجنبی کے چہرے پر گڑ کر رہ گئیں۔

اب پہلی مرتبہ اس نے غور سے اجنبی کو بھرپور گہری اور اپنے اندرونی احساس سے کھلی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا پہلا خیال اور پہلی نظر غلط تھے وہ اجنبی اس کا ہم عمر تو کیا اس کی نصف عمر سے بھی کم تھا۔ لیکن اس کے لڑکے سے اس کی عمر زیادہ تھی اس کا چہرہ بھرا بھرا تھا، اچھا ڈیل ڈول تھا، آنکھیں چمکدار جسم صحت مند تھا، لباس بھی

بہت صاف ستھرا تھا۔ یہ اجنبی واقعی اجنبی تھا، اس شہر کا تو وہ تھا ہی نہیں بلکہ وہ تو شاید کسی اور ملک کا رہنے والا تھا یا پھر وہ دوسرے ملک جاکر بس گیا تھا۔" مگر یہ اطہر کو کیسے جانتا ہے؟ اس نے سوچا اور پھر اپنے اس خیال کو لفظوں کی صورت میں ڈھال کر حلق سے نکلنے والی لہروں کو جسم کے باہر کی ہواؤں میں اس طرح چھوڑا جیسے کوئی سگریٹ کے دھوئیں کو چھوڑتا ہے، لیکن اب اس کا بدن بھی کچھ کانپنے لگا۔ ایک ان جانا احساس اس کے رگ و پے میں مچل اٹھا تھا۔

"آپ۔ آپ اطہر کو کیسے جانتے ہیں؟"

اجنبی نے آئس کریم کے باقی قتلوں میں سے ایک کو منہ میں ٹھونستے ہوئے جواب دیا۔

"اطہر میرا بچپن کا دوست ہے۔ ہم اور وہ لوہ دھن میں کھیتوں کھیتوں گھوما کرتے تھے، میں تو اپنے ماموں کے ہمراہ "لالے" لوہار کی دوکان پہ کام کرتے کرتے ملک سے باہر چلا گیا، اطہر کی بڑی تمنا تھی کہ وہ باہر جاکر کام کرے مگر سنا ہے وہ اپنے باپ کے ہمراہ شہر میں آکر کھو گیا، اب میں بڑی مشکل سے اس کا پتہ نکال کر یہاں تک پہنچا ہوں، وہ یہاں کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے اور پتہ چلا ہے کہ اب ایک ہوشیار فٹر اور کاریگر ہوچکا ہے، میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے بچپن سے ہی اس کی بہن پسند تھی میں نے باہر رہ کر اسی لیے شادی نہیں کی، نہ کسی عورت کو دوست بنایا، مگر اطہر نے تو شادی بھی کرلی ہے اور سنا ہے اس کا بچہ بھی ہے۔"

اجنبی پہلے مزے سے آئس کریم کے قتلوں کو اپنے حلق کے نزدیک تالو سے اوپر زبان سے دباتا پھر منہ میں ان کا مزہ لیتا اور پھر حلق کے نیچے اُن کے گاڑھے رس کو اتار لیتا، اپنی بات سناتے ہوئے اس کی پوری توجہ آئس کریم کھانے کے لطف پر مرکوز تھی اس نے اپنی نگاہوں کو اوپر کی طرف اُٹھنے نہیں دیا کہ وہ اُس بوڑھے راہ گیر سے چار نہ ہوں۔

" اور اطہر کا باپ ابھی تک زندہ ہے، ماں مرچکی ہے، اس کا باپ یہاں اس

شہر میں دھکے کھاتا ہوا، ایک جگہ ملازمت کی مدت پوری کر کے ریٹائر ہو چکا ہے اس نے ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی رقم سے ایک مکان بنا لیا ہے اور اس کے مکان کا نمبر ۱۲۔۲۱۔ ایل ہے، اور اس بستی میں جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں وہ مکان اس سڑک کے آخری سرے سے پہلے والی گلی کے نکڑ پر ہے"۔

"جی۔ آ" یکایک اجنبی نے آئس کریم کے تنتلوں کو زبان پر ہی رہنے دیا اور اس کا منہ کھل گیا اور دانتوں کی قطاروں کے درمیان سے تالو کے بیچ آئس کریم کی گھلی ہوئی شیرینی صاف نظر آنے لگی، چہرہ سرخ ہو گیا۔

"جی ہاں! اور میں اظہر کا باپ ہوں۔ میرا نام اظہار ہے۔ اور تم۔ تم شاید بختیار ہو"۔

"ہاں جی"۔ اجنبی نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز نکالی۔

"جی ہاں، میں بختیار ہی ہوں چاچا اظہار۔ میں معافی چاہتا ہوں میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔"

اجنبی نے کہ جو اب بختیار کا نام پا چکا تھا۔ آئس کریم کھانے کے لیے ہاتھ میں اٹھایا ہوا چمچہ آئس کریم کے برتن میں ٹیک دیا، جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور چاچا اظہار کے گھٹنوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیئے۔ مگر چاچا اظہار نے کوئی حرکت نہیں کی، انہوں نے اس دوران میں کہ جب بختیار بول رہا تھا اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ٹھنڈے پانی کے گلاس کو جس سے وہ گھونٹ گھونٹ پانی پی رہے تھے میز پر رکھ دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں پر ٹکا لیا تھا۔ ان کی آنکھیں بختیار کے پیچھے ہوٹل کے بازو میں لگے ایک درخت کی شاخوں پر جمی ہوئی تھیں جس پر چڑیاں بسیرا کرنے سے پہلے چیخ رہی تھیں۔ سورج اب ڈوبنے ہی والا تھا، ان کے چہرے کی جھریاں تھرتھرا رہی تھیں، انہوں نے بختیار کے کسی سوال کے بغیر ہی بولنا شروع کر دیا جیسے وہ کسی ہمیپنر م کیے ہوئے معمول کی طرح بول رہے ہوں۔

" اس سامنے والی مسجد کے پیچھے ایک اور سڑک ہے جو سیدھی چلی گئی ہے مگر مشرق سے مغرب کو نہیں، شمال سے جنوب کو یا جنوب سے شمال کو، اس پر سے جب چند لوگ کسی کا جنازہ کاندھوں کاندھوں لے کر چلتے ہیں تو قدموں کی آواز اور کلمے کے بولوں کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی، وہاں کوئی آواز ہوتی ہی نہیں! اس سڑک پر کوئی درخت بھی نہیں ہے کہ جس پر چڑیاں ہی چہچہا رہی ہوں، سامنے کی طرف گردن کو جھکائے ہوئے جنازے کو کاندھا دیتے ہوئے چلو تو نہ سورج ڈوبتا نظر آتا ہے نہ اُبھرتا دکھائی دیتا ہے اور جانتے ہو؟ وہ اپنے بچپن کی یادوں کو سینے سے لگائے شہر کی زہر آلود فضاؤں کی کثافت سے مرجھاتے ہوئے اپنے خوابوں کی کرچیوں سے اپنے پھیپھڑے چھلنی کرتی رہی اور اپنے خوابوں اور خواہشوں کو سورج کے ڈوب جانے کے بعد والی سرخی بنا کر حلق سے اگلتی رہی اور ایک دن اس نے اپنے خواب و خواہش کی آخری روشنی سے دھندلائی کرچی کو بھی حلق سے چپ چاپ اگل دیا۔ اور پھر اس کا جسم ہم لے جا کر وہاں دبا آئے۔ اور تم نے اب خبر لی ہے؟ تم نے شادی بھی نہیں کی اور کسی کو دوست بھی نہیں بنایا، اور وہ تو اپنے دل کی بات کا اظہار بھی نہ کر پائی!"

یہ سب کچھ کہتے ہوئے چاچا اظہار ہانپنے لگے اور تنویم کے عمل کے دباؤ سے انہوں نے باہر آتے ہوئے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اٹھایا اور بختیار کے اس ہاتھ پر رکھ دیا جو ہوٹل کی ٹوٹی پھوٹی میز، پگھلتی آئس کریم سے بھری ہوئی پلیٹ کے نزدیک اس طرح پڑا تھا جیسے کسی مجسمہ ساز نے پتھر سے اس کو تراش کر یہاں جڑ دیا ہو۔

" چاچا"۔ بختیار کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا پگھلتی آئس کریم کی پلیٹ کے نیچے اس نے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دبا دیا، اور وہ اُس سیدھی سڑک پر آ گیا جو ۲۱۲۔ ایل کی طرف جاتی تھی۔

جب گھر قریب آ گیا اور وہ چند قدم چل کر بائیں جانب بڑھے تو چاچا اظہار نے

بختیار کی طرف دیکھے بغیر اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"اور اب تم اطہر کو بھی لے جانے کے لیے آ گئے ہو، اور اس کے ساتھ وہ ننّھا بچّہ بھی چلا جائے گا۔ اور میں ۔ یہاں اکیلا رہ جاؤں گا۔" جواب میں بختیار نے صرف اتنا کہا "چاچا!"

اور چاچا اظہار بولے چلے گئے "لیکن وہاں اطہر کو صاف کپڑے نصیب ہوں گے اور بچّے کو مناسب غذا کھانے کو ملے گی، میری فکر نہ کرو۔ دھوپ ڈھل چکی ہے، سورج بھی غروب ہو چلا ہے۔ مجھے اپنے گاؤں کی پگڈنڈی یاد آ رہی ہیں، کھیت یاد آ رہے ہیں، ڈھور ڈنگروں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز آ رہی ہے اور ان کے واپس ہونے والے قدموں سے اُڑتی ہوئی دھول خاک کی دھندلاتی ریت میں ایک سکون بخش خوشبو بسی ہوئی ہے۔ مجھے میری ماں کی اُٹھی ہوئی باہیں یاد آ رہی ہیں۔ مجھے میری ماں کی اُڑتی ہوئی چنری یاد آ رہی ہیں جیسے وہ اب مجھے بڑھ کر اپنے گداز میں سمیٹ لے گی۔"

"چاچا بختیار"، بختیار نے کہ جو، اب اجنبی نہیں رہا تھا، اپنا مضبوط اور توانا ہاتھ اُن کے کاندھے پر رکھتے ہوئے تسلّی کے طور پر تھپتھپایا۔

مکان کے دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے انہوں نے بختیار سے کہا "یہ اب خوف سے سہمے ہوئے گرہوں کی ہجرت کی بات نہیں۔ اب تو تمام دنیا ہی ہجرت کے عالم میں ہے، مسافرت میں ہے۔ اب تو انسانی گروہ، قدیم قصّوں کہانیوں کے بنجاروں کی ٹکڑیوں میں بٹ گیا ہے، آج یہاں ہے تو کل کہیں اور تم اطہر کو ضرور لے جانا اور بچّے کو بھی ہم بوڑھی نسل کے پاس اب کچھ نہیں رہا۔ جب تم سب لوٹ کر کبھی اِدھر آؤ گے یہ سب کچھ بھی جو اِدھر اُدھر نظر آ رہا ہے بدل چکا ہوگا۔ یہ سب کچھ بدلنے کے لیے ہی ہے۔ میں اکیلا نہیں رہوں گا، جب تک یہ درخت یہاں ہیں اور ان پر بیٹھی چڑیاں یہاں موجود، میں ان کی رفاقت مجھے نصیب رہے گی۔ اور جب مجھے اس سیدھی سڑک پر چلنے کا یارا نہیں رہے گا اور کسی کی یاد بھی میرے ساتھ نہیں رہے گی تو پھر وہ جنوب سے شمال کو جانے والی سڑک پر میں نکل جاؤں

گا۔ میں اس سڑک پر خود تو چل کر نہیں جاؤں گا کہ میرے قدم تھک چکے ہوں گے مگر وہاں جہاں مجھے لے جایا جائے گا وہیں زینب کی خوشبو ہوگی جس کو پاکر میری تمام تھکن دور ہو جائے گی۔ ہاں، تم اطہر کے ساتھ آج رات اُس کی قبر پر چراغ جلانے ضرور جانا۔ وہ اس چراغ کی منتظر ہوگی، اس کو تمہارے قدموں کی آہٹ کا بھی انتظار ہوگا!،،

اب سورج ڈوب چکا تھا۔ مسجد سے اذان بلند ہو رہی تھی، اُس نے اپنے مکان کے در پر ہاتھ رکھا اور یکایک ایک بچّہ جیسے وہ کواڑوں کے پیچھے ہی کھڑا ہوا تھا لپک کر چاچا اظہار کی گود میں چڑھ گیا۔ چاچا اظہار نے بچّے کو سینے سے لپٹا لیا۔ ابھی اطہر واپس نہیں آیا تھا وہ رات کو دیر سے ہی آتا تھا چاچا اظہار نے پھر بختیار کا ہاتھ تھام لیا اور اس کو لے کر مکان کے سامنے عارضی طور پر بنے ہوئے چبوترے کی طرف کھینچتے ہوئے بٹھا کر کہا۔

،،تم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا کہ زینب نے تمہارے بارے میں کوئی بات مجھے یا کسی اور کو بتائی تھی، ایسا نہیں تھا، جب تک ہم لوگوں کا فطرت سے تعلق قائم رہتا ہے ہماری تمام حسیّات بیدار رہتی ہیں بس مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ تم تھے جس کا وہ انتظار کرتی رہی تھی، لیکن میں نے اس کے بدن کی خوشبو اس کی سانسوں کے اتار چڑھاؤ سے اس کی آنکھوں میں ڈوبتی ابھرتی روشنی سے، اس کا سب راز پالیا تھا۔ یہ تعلق میں نے اس بوجھل فضا میں بھی اپنے سینے میں ابھی تک بچا کر رکھا ہوا ہے۔ مجھے تو اس زمین کی خوشبو بھی معلوم ہے کہ جہاں میرے بدن کی مٹی گوندھی جائے گی جس میں مجھے شامل ہونا ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے، اب تم واپس جاکر اس لڑکی کو اپنا لوگے جس کو اپنانے سے تم نے زینب کی وجہ سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بات یاد رکھنا بختیار کہ اطہر میں وہی خون ہے اور اسی خون کی خوشبو ہے جو زینب کے جسم میں تھا اور جس میں تمہاری یاد کی خوشبو رچی ہوئی تھی، وہ اطہر کو اور بچّے کو پیار کرتی تھی، اس تعلق کو بھول نہ جانا تمہاری اولاد

جہاں اور جس زمین سے بھی اُٹھے گی اس میں زینب کی خوشبو ہو گی، وہ خوشبو کہ جو اب بھی تمہارے بدن میں سانسوں میں دماغ میں فکر اور احساس میں موجود ہے اور جو اب ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔ مگر زینب کو بھول جانا، جس لڑکی کو تم چھوڑ آئے ہو اس سے جا کر شادی کر لینا۔"

چاچا اظہار خلا میں گھور کر دیکھتے ہوئے یوں بولے جا رہے تھے جیسے وہ لکھا ہوا پڑھے جا رہے ہوں۔

"بابا! آپ کے پاس سے آئس کریم کی خوشبو آ رہی ہے۔" وہ بچہ جو اندرونی کوڑول سے نکل کر اس کے سینے سے آلگا تھا اور اب جو، اِن دونوں کے درمیان خاموش بیٹھا نہ سمجھنے والی اُن کی باتیں سن رہا تھا اور جس کے تیز اور تازہ احساس نے بختیار کی سانسوں سے ابھر کر بکھرنے والی آئس کریم کی خوشبو کو اُچک لیا تھا۔

"ہاں۔ آؤ آئس کریم کھائیں۔" بختیار نے بچے کو اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا

"سچ!" وہ تالیاں بجانے لگا اس کی آنکھوں میں تارے اترنے لگے۔

"آئیے چاچا آپ بھی آئیے۔" اس نے چاچا اظہار سے کہا۔

"نہیں تم دونوں جاؤ۔ میں اب یہاں سے اُٹھ کر نہیں جاؤں گا۔"

بختیار بچے کو گود میں لیے ہوئے سڑک کے کنارے بنے ہوئے اس ہوٹل کی طرف چل دیا جہاں سے وہ چاچا کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

چاچا اظہار وہیں چبوترے پر گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ کافی دیر گزر گئی وہ زینب کی زندگی اور اپنی مجبوری کی ردا اوڑھے اپنے سوکھ جانے والے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں تر کرتا رہا۔ اس نے قدموں کی چاپ سنی۔ اطہر آ رہا تھا۔

"اباجی!" اطہر نے اس کے قریب آ کر اس کا کندھا چھوا۔

چاچا اظہار نے گردن اٹھائی، اطہر کو دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

اور اس کو بختیار کا آنا اور اُس سے ہونے والی گفتگو سب سنا ڈالی، اور نہایت احتیاط کے لہجے میں اس سے کہا "دیکھو اطہر۔ یہ بات بختیار کو نہ معلوم ہو کہ تمہارا کہلانے والا بچہ میرا پوتا نہیں نواسا ہے، وہ زینب کے بدن کا حصہ ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو چاند پر داغ آجائے گا۔ ہم پر جو کچھ گاؤں میں گزری اور ہم زینب کو اُس ستم سے بچا نہ سکے جس کے نتیجے میں اُس نے بچے کو جنم دیا اور بختیار کو یاد کرتی ہوئی اور اس بچے کو چھوڑ کر وہاں جا سوئی۔ وہ بیچاری اپنا منہ بختیار کو کس طرح دکھلاتی۔ زمین نے اس پر رحم کیا اور اس کو اپنے آپ میں سمیٹ لیا۔ سمجھے! وعدہ کرو کہ ہماری بربادی اور زینب کی خواری کا بختیار کو نہیں معلوم ہوگا"

"چاچا مجھے تو گاؤں میں ہی سب کچھ معلوم ہو گیا تھا" چاچا اظہار اور اطہر چونک پڑے۔ بختیار بچے کو گود میں ایسے لیے ہوئے تھا جیسے بچھڑا ہوا وہ باپ جو طویل سفر کے بعد واپس آیا ہو اور اپنے بچے کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے دل میں اتار لینا چاہتا ہو بچے کے ہونٹ اور رخسار آئس کریم سے لتھڑے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھوں میں آئس کریم کا ایک اور بڑا سا پیکٹ بھی تھا۔

"چاچا مجھے معلوم ہے زینب معصوم تھی" اب چاچا اظہار کی جگہ بختیار کسی تنویمی عمل کے زیر اثر بول رہا تھا "مجھ کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے"

اس نے اپنا ایک بازو بڑھا کر اطہر کو اپنی طرف کھینچا اور سینے سے لگا لیا، اس کی آواز رُندھنے لگی تھی، مگر وہ بولے گیا "یہ ہمارے ٹوٹتے ہوئے سماجی دباؤ کے آخری جھٹکے ہیں، آج کی دنیا میں کل کی دنیا کا وہ شخص بھی جو اپنے آپ کو حاکم سمجھتا تھا اور عورت کو آئس کریم سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، اب خود بھی ختم ہو رہا ہے۔ آپ تو گاؤں چھوڑ کر ادھر آگئے اور ادھر گئے ہی نہیں کہ اپنی مجبوری اور غیرت کے خون کا چھڑکاؤ جو وہاں سے کر کے آئے تھے اس کی فصل کو اُگتے دیکھتے۔ اب وہاں گاؤں کے کھیتوں میں ٹریکٹر چلتے ہیں جن سے بھک بھک کی آوازیں نکلتی ہیں۔ اب

وہاں ڈھور ڈنگروں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی میٹھی آوازیں گم ہو گئی ہیں، دیہات کی دنیا ہی بدل چکی ہے مگر چاچا، میرے خون میں ابھی وہ بو باس ہے جس کو غیر ملک میں رہ کر بھی میں نے اس طرح محفوظ رکھا ہے جس طرح یہاں آپ نے اس کو بچا بچا کر رکھا ہے۔ ایک بات ضرور ہے میں نہ مایوسی کا شکار ہوا ہوں اور نہ محرومی سے نڈھال، وہاں رہ کر جو بات میں نے سیکھی ہے وہ کسی حادثے کو برپا کرنے والے انسانوں پر نہ اپنا غصہ اتارنا ہے نہ ہمیں صدمہ پہنچانے والوں اور بے توقیر کرنے والوں سے اپنے جذبات کی توہین کا بدلہ لینا ہے۔ چاچا! اب تو دنیا دو طرح کے انسانوں میں تبدیل ہو چکی ہے، انتقام لینے والے، تشدّد کرنے والے تکلیف پہنچانے والے یا دنیا کو امن، انسان دوستی اور سلامتی کا گہوارہ بنانے والے، اور ان خراب حالات، کو جو انسانوں کے لیے اذّیت کا باعث ہیں ختم کرنے کا مضبوط ارادہ رکھنے والے لوگ، اور وہ جو بہتر انسانی جذبوں کو صدمہ پہنچانے والے لوگ کہ جو انسان کو انسان کے خلاف صف آرا کرتے ہیں، اب ان سے ہر جگہ کھلی نفرت کی جاتی ہے اور اس نفرت کو بُرے لوگ اب اپنے گریبانوں کے اندر تک اترتا خود بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔"

بختیار بولے چلا جا رہا تھا اس کے لہجے میں اعتماد نرمی اور بھروسہ سب نے مل کر اس وقت کی فضا کو ملکوتی ماحول میں تبدیل کر دیا تھا۔ چاچا اظہار، اطہر اور بچّہ، سب خاموش تھے اور اب تو چڑیاں بھی شاخوں پر اپنا بسیرا کر کے خاموش ہو چکی تھیں۔

"یہ سب باتیں چاچا حالات کی پیدا کی ہوئی ہیں، اب دنیا سکڑ رہی ہے انسانی شعور کو زمانے نے اس قدر صیقل کر دیا ہے کہ اس کے دھندلانے کا کوئی امکان نہیں رہا، یہ بچّہ جس کو میرا بیٹا ہونا چاہیے تھا، اب بھی میرا بیٹا ہے یہ میری گود میں ہے یہ کسی بُرے اور ظالم انسان کا بیج ہو سکتا ہے مگر فطرت بُری نہیں ہوتی فطرت

معصومیت کا ہی دوسرا نام ہے فطرت تبدیل ہو رہی ہے مگر انسان کو انسان بنانے کے لیے اس کی تمام معصومیت کے ساتھ انسان بنانے کے لیے !! یہ میرا بیٹا، یہ ان حالات کو جو بڑے لوگوں کے ہاتھوں اب بھی کہیں کہیں برپا ہوتے ہیں ختم کرنے والوں میں شامل ہوگا۔ وہ ان صفوں میں ہوگا کہ جو بُرے حالات کو بھلے میں تبدیل کرنے کے لیے منطقی طور پر تیار ہو چکے ہیں، وہ اُن لوگوں میں شامل ہوگا جو زینت کی موت کا سبب بننے والوں کو راہِ راست پر لانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ یہ بات اب فطری راہ پا چکی ہیں جس میں انتقام کا جذبہ نہیں، انسانی نہم کی اصلاح کا جذبہ ہے۔ یہ دیکھیے چاچا فطرت ہی تو ہے کہ جس نے میری گم شدہ خوشبو سے مجھے پھر سے ملا دیا" اس نے بچے کو ایک بازو سے دوسرے بازو میں منتقل کرتے ہوئے اطہر سے کہا" چلو اطہر زینب کے مزار پر پہلے چراغ جلا آئیں۔ آج ہم سب وہاں چلتے ہیں۔ پھر آکر باتیں ہوں گی اور آنے والے دنوں کی باتیں کریں گے"۔

چاچا اظہار بولے" نہیں تم لوگ جاؤ، میں اب پیدل نہیں چل سکتا، میں اب تنہا اس خوشبو سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں، جو تمھاری باتوں نے میری نس نس میں اتار دی ہے"۔

(۱۹۷۹)

دُہرے موسموں کا عذاب

میں نے بنگلے کے گیٹ کے باہر ہی جیپ رکوا دی اور اُتر کر ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ روشنی بجھا کر بہت آہستہ سے جیپ کو گیراج تک لے جا کر رکھ دے اور گھر چلا جائے، رات کے دو بج چکے تھے میں صغرا کی نیند خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نہایت آہستہ سے گیلری کی جانب کے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوا، اور ڈرائنگ روم سے بیڈ روم میں جھانک کر دیکھا۔ صغرا نہایت آرام سے سو رہی تھی۔ بھوک کے مارے میرا بُرا حال تھا، لیکن میں نے اس وقت اس کو جگانا قطعی مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے غور سے اس کے چہرے پر نظر ڈالی جو ہلکے زیرو پائنٹ کے نیلے رنگ کی بلب کی روشنی میں ایسا ہی جوان، تر و تازہ اور شاداب تھا، جیسا کہ شادی کی پہلی رات کو میں نے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نہایت معصوم روپ کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔

ہماری شادی کو ایک بڑا عرصہ گزر چکا تھا، لیکن ہم دونوں اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ محبّت میں البتہ کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے اس کے اور اپنے علاج کے لیے سرکاری ملازمت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے یورپ اور امریکہ کے بھی سفر کیے۔ لیکن ہم جس کی تلاش میں تھے وہ قدرت کی طرف سے شاید ہماری تقدیر

میں درج ہی نہیں کی گئی تھی۔ اور پھر ہم دونوں میں ایک خاموش معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہم کو زندگی بس اسی طرح گزارنا ہے۔ اب اولاد کے نہ ہونے کے بوجھ سے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ کم سے کم میرا یہی حال تھا، لیکن صغرا نے بھی مدتوں سے اس بارے میں اپنے کسی ملال کا اظہار کرنا چھوڑ دیا تھا، ہم دونوں ایک دوسرے سے اکثر خود بچے بن کر کھیلتے ایک دوسرے کی چھیڑ خانی کرتے اور محظوظ ہوتے اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کا بچوں ہی کی طرح خیال بھی رکھتے۔ بچوں کی طرح روٹھتے اور پھر بچوں کی طرح ہی من جاتے۔ میں نے اس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی۔ بھوک جو لگ رہی تھی۔!

میں نے خاموشی اور آہستگی سے کپڑے اتار کر ڈرائنگ روم کے صوفے پر ڈال دیے اور بہت احتیاط سے کہ شور نہ ہو، جوتے اتارے اور محض انڈرویئر اور موزے پہنے ہوئے، برابر کی گیلری سے کچن کا دروازہ کھول کر کچن میں داخل ہوا، اور ہلکا بلب روشن کر کے گیس کا چولہا جلایا، اور انڈوں کی ڈش سے دو انڈے نکلے کہ اس وقت اس سے بہتر، آسان اور ضرورت کے مطابق کھانا فراہم ہونا مشکل تھا۔ میں گھی فرائی پان میں ڈال کر ابھی انڈے توڑ کر ڈالنے ہی والا تھا کہ میری پشت پر سے صغرا کی آواز سنائی دی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایں ...!“

صغرا کے لہجے سے ہی میں نے پتہ چلا لیا کہ اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے میرے قریب آکر میرا بازو پکڑا۔ اور بولی۔

”ہٹیے یہاں سے۔ جا کر منہ ہاتھ دھوئیے اور پاجامہ پہن کر کرتا گلے میں ڈالیے اور گاؤن پہن کر ڈائننگ ٹیبل پر آجائیے۔ اور ہاں! یہ بدبو دار موزے فوراً اتار کر پھینکیے۔ سمجھے آپ!“ اس نے ایک سخت گیر ماں کی طرح بچے کو ڈانٹنے کا لطف لیا۔

" اچھا۔ اچھا میں جاتا ہوں لیکن آخر تم کیسے جاگ گئیں میں نے تو بہت احتیاط کی تھی کہ تم نہ اُٹھ پاؤ۔"

" میں سو تو نہیں رہی تھی۔ آپ کے آجانے سے پہلے کیا مجھے نیند آسکتی تھی؟ جانیئے آپ! میں نے پہلے ہی آپ کے لیے شامی کباب کے سینڈوچز تیار کر رکھے ہیں اور سنیئے! میں آپ کو کافی قطعی نہیں پینے دوں گی۔ میں آپ کے لیے "کمپلان" بنا کر لاتی ہوں۔"

میں خاموشی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ جب میں کھانے کی میز پر کپڑے تبدیل کر کے پہنچا صغرا سب کچھ تیار کیے میری منتظر تھی۔ جب تک سینڈوچز کھاتا رہا۔ صغرا مجھے خاموش بیٹھی دیکھا کی، جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو کھاتے دیکھتی ہے اور خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔

" کمپلان" کا پہلا ہی گھونٹ میں نے لیا تھا کہ صغرا نے افسری شروع کر دی۔

" آخر آپ نے آج اس قدر دیر کیوں لگا دی۔ کہاں تھے؟"

" غلطی ہو گئی سر!" میں نے قطعی ایک سب آرڈی نیٹ سرونٹ کے لہجے میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے جواب دیا۔ دن بھر حکم چلانے کے بعد جب مجھ جیسے لوگ اپنی بیویوں کے سامنے اس طرح جواب دہی کرتے ہیں تو ان کو جو مزہ آتا ہے، جو کیف اور سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کو مجھ جیسے اعلیٰ افسر ہی جان سکتے ہیں۔

" وہی ہنگاموں کا سلسلہ تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

" آج پھر۔ آج پھر۔" میں نے کہنا چاہا، وہ گھبرا گئی۔

" کیا۔ کیا۔ آج پھر گولی چلی؟ کتنے مارے گئے؟" صغرا نے خوف میں ڈوبی آواز میں جواب طلبی کی۔

" بھئی پھر میں کیا کروں؟ میں بھی تو احکامات پر عمل درآمد کے لیے مجبور ہوں

مجھے کیا یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے؟ کیا میرے جسم پہ کھال اور اس پہ گوشت پوست اور اس کے اندر دل نہیں ہے؟ کیا میں گولی لگنے کے احساس کو نہیں جانتا۔ آخر میں کیا کروں۔ ان سب کو سمجھانے کا کام میرا نہیں ہے۔ ان کو روکنا میرا کام ہے۔ یہ تو قانون سازوں کا کام ہے، سیاسی نظریے تشکیل دینے والوں کا کام ہے کہ وہ ان کو سمجھائیں۔ مجھے تو ان کو قابو میں رکھنے کے لیے کام سکھایا گیا ہے۔ اس کے لیے چاہیے جبر و تشدد اختیار کیا جائے۔ چاہے لاٹھی گولی "۔ بولتے ہوئے میری آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی۔ صغرا نے آہستہ سے ڈائننگ ٹیبل پر پھیلے ہوئے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس نے میرے اندر کے غصّے کو پالیا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ "خدا کے لیے اب رونا شروع نہ کر دینا۔ صغرا مجھے یہ سب قطعی پسند نہیں ہے۔ لیکن میں نے جن پابندیوں کو اس ملازمت میں اختیار کیا ہے۔ میں ان میں جکڑا ہوا ہوں۔ ان سے چھٹکارہ بھی تو مشکل ہے۔ میں احکامات کی بجا آوری کے لیے مجبور ہوں۔ ان میں کوتاہی کا میں سزاوار نہیں ہو سکتا۔ مجھے انسان۔ چھوٹے بڑے انسان۔ بچے اور بوڑھے سب شور مچاتے ہوئے بھی اچھے لگتے ہیں اور اپنی تکلیف اور مشکلات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بھی! یہ انسان سب معصوم ہیں، ان کو تو اپنے بعض مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، ان کو ان کی مجبوریوں، خواہشوں اور ضرورتوں کے حصول کا لالچ دے کر۔ اور جب ان کو استعمال کرنے والوں کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔ تو پھر سب کچھ بھول جانے کو کہا جاتا ہے، اسی کا نام سیاست ہے اور ضرورتِ وقت بھی! اور یہ ہمارا طبقاتی جبر ہے کہ جو کچھ کہا جائے۔ بس اس پر ہم عمل کریں "۔

میں اس طرح جھلا کر بول رہا تھا جیسے میں بپھرا بیٹھا تھا۔ صغرا کی آنکھوں کو دیکھ کر میرا غصّہ اور غم یکایک کم ہو گیا۔

" اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ سب تو اب روز کا معمول بن گئی ہیں "۔ یہ کہتے

ہوئے میں نے صغرا کے نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اس سے پوچھا "یہ کہو کہ آج تم کیا کرتی رہیں۔ آج تمہارا دن کیسا گزرا؟"

"وہی ہر روز کی طرح آج کا دن بھی گزرا، وہی کم بخت پیچھے کوارٹروں میں رہنے والوں کے بچوں نے دیوار پر چڑھ کر آج پھر میرے گملے توڑ دیئے اور میرے پودوں اور میری لگائی ہوئی "پنیری"، کا ستیاناس مار دیا۔ سب کچھ تباہ کر ڈالا۔ اور وہ لالو جس کا آپ بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس نے آج میرا منہ بھی چڑایا۔"

"ارے اس کی یہ مجال۔ دیکھو میں صبح ہی سلام کے ذریعے اس کو بلوا کر اس کی گوشمالی کرتا ہوں لیکن آخر بات کیا ہوئی تھی۔ انہوں نے گملے کیوں توڑ دیے، تمہاری "پنیری"، کو کیوں تہس نہس کر دیا؟ آخر بات کیا تھی؟" میں نے صغرا سے پوچھا۔

"بس بات اتنی تھی کہ لالو نے آج پچھلے میدان میں کرکٹ کے میچ کا انتظام کیا تھا، اور ایک گلدان کہیں سے کپ بنا کر لے آیا تھا، اس میں گلاب کا پھول لگانا چاہتا تھا، اس نے میرے بڑے گلاب کے پودے سے تین پھول توڑ لیے، جب مجھے پتہ چلا تو میں وہاں پہنچی اور ان کے کپ سے وہ پھول نکال لیے۔ بس پھر تو غضب ہو گیا!"

"اوہ! تو یہ بات تھی۔ آخر تم نے پھول واپس کیوں لے لیے تم بھی تو ان کو توڑ کر بیڈ والے گلدان ہی میں سجاتیں! ہم یہاں دو تھے جو، ان سے لطف اندوز ہوتے اور وہاں وہ سب بچے تھے جو پھولوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں اور جب کہیں نہیں ملتے تو وہ ہمارے جیسے بنگلوں کی پھلواری سے لے اڑتے ہیں۔ ان کو کیا یہ حق نہیں ہے؟"

جانے میں نے کس طرح یہ بات کہی کہ پہلے صغرا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ

دو آنسو گرے اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

"خدا کے لیے صغرا۔ چپ ہو جاؤ۔ دن بھر کی اذیت ناک ذمہ داری کے بعد کہ جس سے دل فگار ہے اب تمہارے آنسو برداشت نہیں ہوں گے بس چپ ہو جاؤ"۔ میں نے اٹھ کر صغرا کے دوپٹے کے آنچل سے اس کے آنسو خشک کیے اور ایک ناراض بچی کو منانے کے سے انداز میں اس کو اپنے بازوؤں میں لے کر اور خود سے چمٹا کر بیڈ روم کی طرف لے چلا۔ اب اس کے آنسو تھم گئے تھے۔

جب ہم بستر پر لیٹے تو میں نے اس کی دل دہی کی خاطر اس سے پوچھا۔

"صغرا۔ تم نے آج اپنے ہاتھ سے پان تو کھلایا ہی نہیں!"

"مجھے پتہ ہے آپ کو صبح سویرے ہی پھر بھاگنا ہوگا، وہ ٹیبل پر پلیٹ میں الائچیاں رکھی ہیں انہیں چبا لیجیے"۔

"اچھا"۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر الائچیاں اٹھائیں اور منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔

صغرا بولی "آخر یہ آئین اور قانون و قواعد اور ضوابط بنانے والے آپ جیسے قابلِ اعتبار لوگوں کے منہ میں "فائر" کا لفظ کیوں ٹھونس دیتے ہیں اس کے بجائے، پیار، احترام اور محبت و شفقت کے الفاظ کیوں نہیں رکھے جاتے! الائچی کی خوشبو کی طرح پیارے پیارے لفظ"۔ الائچیوں کو چباتے ہوئے صغرا کی طرف رُخ کرتے ہوئے میں نے اس کی بات کا جواب دیا۔

"صغرا۔ جانتی ہو۔ یہ گولیاں جو جسم کو فائر کے حکم پر پھاڑ کر رکھ دیتی ہیں، اُن کو ایسے ہی انسان بناتے ہیں جن کے بچے بھی ہوتے ہیں اور عزیز اور پیارے بھی۔ اور وہ انہی کی طرح کے گوشت پوست کے بنے ہوئے ہوتے ہیں جیسے گولی سے چھلنی ہو جانے والوں کے جسم ہوتے ہیں۔ انسان سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دنیا میں انسان ہی چاقو چھری بناتا ہے سبزی کاٹنے اور قلم بنانے کے لیے اور انہی چاقو

اور چھریوں کو دوسرے لوگ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے جیسے انسانوں کے جسموں میں گھونپ دیتے ہیں۔ یہ سب نہ کیا جائے تو دنیا کے یہ بڑے لوگ جو اس قسم کی صنعت اور تجارت سے وابستہ ہیں کیا کریں گے؟ یہ اُن کا جبر ہے اور یہ ہماری مجبوری ہے کہ ان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

صغرا نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"میں نے اور آپ نے ساتھ ساتھ سب کچھ پڑھا ہے۔ یہ فلسفیانہ بات میں جانتی ہوں لیکن۔" صغرا لیکن۔ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔"شاید نیند آرہی ہے؟ اچھا سو رہو۔" یہ کہہ کر میں نے کروٹ بدل لی۔"اچھا شب بخیر!" میں نے گویا سونے سے پہلے اپنی آخری بات کی۔

ایک ٹھنڈا سانس بھر کر اور کچھ رک کر صغرا نے کہا۔"مجھے سب کچھ سلام نے بتلا دیا ہے، کتنے مارے گئے، کس طرح مارے گئے۔" اتنا کہتے کہتے اس کی آواز بھرانے لگی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"صغرا۔ خدا کے لیے میں بہت دکھی ہوں، اب مجھے کیوں زیادہ نڈھال کرنا چاہتی ہو، ہم جس جبر کا شکار ہیں، وہ ہم نے خود اپنے لیے تو پسند نہیں کیا ہے؟"

"وہ بولی۔" میں ایک عورت ہوں۔ میری کوکھ ہری نہ ہوئی تو کیا ہوا، میں اس کے درد اور کرب کی لذت کو سمجھتی تو ہوں۔ جب کسی بچے کے مرنے کا پتہ چلتا ہے تو میری کوکھ تڑپ اُٹھتی ہے۔ کاش۔ کاش!! وہ بچہ جس کو "گولی" سے ضائع ہو جانا تھا، ہم کو عطا ہو جاتا۔ یا اللہ ایسا کیوں نہ ہوا؟"

میں نے تسلی دیتے ہوئے صغرا سے کہا۔"صغرا یہ تو قدرت ہی جانتی ہے کہیں گولیاں ڈھلتی ہیں اور بارود بنائی جاتی ہے اور کہیں گلاب کے پھول کھلتے ہیں جن کی حفاظت کے لیے کانٹے بھی ہوتے ہیں جو اکثر ان پھولوں کو توڑنے والوں کی انگلیوں ہی کو

نگار نہیں کرتے بلکہ دل و جگر تک اُتر جاتے ہیں۔ کوئی گلاب کے پھولوں کی تمنا کرتے ہے اور اس کے ہاتھ سے پھول چھین کر اس کو نفرت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ سو رہو۔ صغرا۔ سو رہو۔ ہم دوہرے عذاب کے موسموں سے گزرنے والی نسل کے لوگ ہیں۔ آخر تمہاری گود سے میرے سائے میں وہ نسل کیوں پروان چڑھے جو گولی چلانا اور گولی کھانا جانتی ہو۔ اس سے تو خالی گود مر جانا اچھا ہے۔"

میں نے اس کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور وہ یونہی کانپتی سسکتی بچی کی طرح میرے بازوؤں میں ہی آخر کو سو گئی۔

(۱۹۸۹)

نجم الانشاء

”ہوا کی لہروں پر رقص کرتے بادل، ہوا کے آنچل سے الجھی پھولوں کی خوشبو اور پیاروں کے بدن سے پھوٹتی مہک، یہ سب جگہ، رکاوٹوں سے آزاد، یکساں نوعیت سے سرگرم سفر رہتی ہے نہ جغرافیائی حدود کی پابند نہ کسی رکاوٹ سے آشنا، پانی بھرے بادلوں کا ایک جھلا انسان کی بنائی ہوئی سرحدوں کے اُدھر گرتا ہے تو دوسرا جھلا اِدھر۔ انسانی یادیں اور خواب بھی نہ سرحدوں میں قید ہیں اور نہ وقت و نا وقت کے موسموں سے آشنا! جہاں سے چاہے ہو گزریں۔

قدیم عمارتوں کی ممٹیوں پر غٹرغوں کرتے کبوتروں میں اپنے بزرگوں کی روحیں تلاش کرنے والوں کی فکر اور سوچ بھی یکساں ہے بس جو اِدھر سے اُدھر ہو جائے اور جس جگہ ٹِک جائے وہاں کی اقدار اور رہن سہن کے طریقوں میں ڈھل جائے اور دوسرے بھی کہ جن کے درمیان جاکر وہ اپنا ٹھکانا بنائے اس کے رواج اور مزاج کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ نئے نہیں، انسان اس کو تاریخ کے ادوار کا نام دیتے رہیں ہاں! کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جو جس عمل اور چیز کو خود کے لیے بہتر چاہتا ہے اور جس اچھائی کو پسند کرتا ہے اس کو دوسرے کے لیے ناپسند کرتا ہے اور نہ اختیار، تو یہ عمل ایک دوسرے میں سما جانے کے رویّہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ غیریت برقرار رہتی

ہے اور اپنائیت منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔

یہ ممٹیوں پر غٹر غوں کرتے کبوتر کہ جو ارضی و سماوی آفات کے غیر معمولی جھٹکوں کے بغیر نہ اپنی رہائش بدلتے ہیں نہ ماحول۔ ان کبوتروں کے پروں کی ہلکی جنبش سے پیدا ہونے والی آشنا خوشبو کے ساتھ انسان بہ صورت نگاہ یا بہ صورت خیال ذہنی طور پر دوڑتا چلا جاتا ہے کبھی یہ کبوتر اجاڑ عمارتوں کی برجیوں پر بسیرا کر کے وہاں کے ماحول کے حسبِ حال خود کو ڈھال لیتے ہیں اور یا پھر جدید عمارتوں کی شفاف بلند اور چکنی دیواروں میں کوئی نہ کوئی گوشہ اور سہارا تلاش کر کے خود کو موسموں کے اتار چڑھاؤ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ کیسی روحیں ہیں جو کبوتروں کے بھیس میں اِدھر سے اُدھر تک آباد ہیں اور بدلتے وقت کے ساتھ اپنی روِش کو بدل ڈالتی ہیں۔ انسان انہی سے پیار کرتا ہے لیکن انسان کے ہی بچّے اپنے غلیلوں کے نشانوں کو ان پر آزماتے ہیں، یا ہاتھوں میں چھرّوں کی بندوقیں لیے ہوتے ان پر آزماتے ہیں۔ یہ سیدھی سادھی غٹر غوں روحیں، ویرانوں میں ہوں یا روشن عمارتوں کے اوپر، اِن شریر بچّوں سے خوف کھانے لگتی ہیں اور یہ پُر امن کبوتر اس پر حیرت کرتے ہیں کہ یہ شریر ہٹیلے بچّے اُن کے ہی ہم رُتبہ ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کے اُس غول کی کہانی کو کیوں بُھول جاتے ہیں جو اپنی چونچوں میں ایسی چھوٹی چھوٹی کنکریاں لیے ہوئے نمودار ہوتے ہیں کہ اصحابِ فیل بھی اُن کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں!"

دوپہر گزر جانے کے بعد کی تنہائی میں حیدر آباد کے جنرل پوسٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھے سامنے ایک روشن دان کے چھجے پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کو دیکھتے ہوئے وہ خاموشی سے سوچے چلے جا رہے تھے، ان کے ساتھ جو دوسرے لوگ انہی کی طرح پوسٹ آفس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر خطوط نویسی کرتے تھے۔ چند دن سے شہر کی افواہ

سازی کے تذکروں سے گھبرا کر گھر جا چکے تھے۔

آج کی صبح جب وہ گھر سے چلے تھے تو بہت افسردہ سی فضا تھی، وہ حسب معمول ناشتہ کر کے کپڑے بدل کر اور شیروانی پہن کر (وہ ہمیشہ سردیوں میں کالی اور گرمیوں میں سفید شیروانی پہنتے تھے اور یہ بھرم اب تک وہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ٹوپی اوڑھی اور اجرک کا چھوٹا سا ٹکڑا کندھے پر ڈالا اور اپنی خطوط نویسی کی مزدوری کا تھیلا جس میں قلم دوات اور کاغذ لفافے وغیرہ تھے لے کر بڑے ڈاک خانے روانہ ہو گئے۔

بڑا ڈاک خانہ اب واقعی بڑا ہو چکا تھا لیکن آج جب وہاں پہنچے تو چہل پہل کم تھی اور ان کے کئی ساتھیوں میں سے صرف دو ہی آج آئے تھے چند دنوں سے شہر افواہوں کی زد میں تھا ہی تنہائی میں ان کی سوچ" ان افواہوں کے حوالے سے ماضی بعید اور ماضی قریب کے سمندر میں سفر کرنے لگی۔

" انھوں نے اپنی دونوں نوجوان بچیوں کی یکایک موت کے صدمے کو تو رضائے الٰہی سمجھ کر برداشت کر لیا تھا اور ان کی بیوی بھی صبر کر کے بیٹھ رہی تھیں اور جب ان کو عدالت کے عہدے کی ذمہ داریوں سے ان کے سیاسی خیالات کو سامنے رکھ کر سبک دوش کیا گیا تب بھی انھوں نے اس کو ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔ لیکن بھگوان سہائے کی اس آخری دعوتِ افطار میں، جو بھگوان سہائے اپنے تمام مسلم دوستوں کو ہر سال رمضان شریف کے دوسرے ہفتے میں دیا کرتا تھا، اور جس میں ہندو احباب بھی خندہ پیشانی سے شرکت کرتے تھے، شنکر دیال کی کہی ہوئی بات وہ برداشت نہ کر پائے، اس کا لہجہ، اس کی تلخی اور تضحیک آمیز اظہار رائے نے ان کو نڈھال کر دیا۔ اس نے کہا تھا " اب یہ میاں صاحب اپنے اس ملک کو کیوں نہیں جاتے جس کو انھوں نے ہمارے دیش کو کاٹ کر حاصل کیا ہے۔ کب تک یہ دعوتیں اڑاتے رہیں گے؟"

شنکر دیال کے اظہارِ خیال سے محفل پر سناٹا سا چھا گیا لیکن بھگوان سہائے نے کسی نہ کسی طرح بات کو سنبھالا اور اس کا رخ ہنسی مذاق کی طرف پھیر دیا۔ افطار کے بعد بھگوان سہائے

کے کشادہ صحن پر بنے بڑے چبوترے پر مغرب کی نماز ادا کی جاتی لیکن وہ سب کی نظر بچا کر دل گرفتہ اور ملول باہر نکل کر قریب کی مسجد میں چلے گئے۔

نماز کے بعد مسجد سے باہر آتے ہوتے انھوں نے طے کر لیا کہ اب واقعی یہاں رہنا درست نہیں۔ یہ گھاؤ اُن کے لیے بڑا تھا، بہت بڑا۔ اُن کے بھگوان سہلتے سے ہی نہیں کہ جو پرانی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔ شنکر دیال کے باپ اور چچا سے بھی جواب مر چکے تھے گہرے مراسم رہے تھے۔ شنکر دیال کا اس طرح اظہار خیال نہایت گہرے اور سخت گھاؤ کی صورت میں اُن کے دل پر لگا تھا، انھوں نے اپنی دکالت کے زمانے میں ان تمام ہندوؤں کے لیے کام کیے تھے جو اس محفل میں موجود تھے اور دوسرے اداروں کے بھی زخم خوردہ تھے، اپنی قانونی فراست سے اُن کے حقوق سوخت نہیں ہونے دیئے تھے اور ان میں سے ہر حق دار کو اس کا قانونی حق دلوانے میں بڑی جاں سوزی کی تھی۔ لیکن آج صورتِ حال بدل چکی تھی، ان کا ماضی اُن سے چھینا جا رہا تھا اور مستقبل وہ شاید اب یہاں رہا نہیں تھا!

ہندستان چھوڑتے وقت انھوں نے نہ اپنی جائداد فروخت کی نہ قیمتی سامان اونے پونے ٹھکانے لگایا۔ وہ چلنے کا حتمی فیصلہ کرتے ہی اپنے ایک ہندو دوست دیوی دیال کے پاس پہنچے، جو، ان کے تحت جوڈیشری میں کام کر چکے تھے، اپنے گھر کی جس میں ضرورت اور آسائش و آرائش کا سب سامان موجود تھا، چابیاں دیں اور اپنی اُس بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کہ جس نے کبھی پیدل گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا برقعہ اوڑھا کر ریلوے اسٹیشن لے گئے اور پھر بہ ہزار دشواری کھوکھرا پار سے ہوتے ہوئے میرپور خاص پہنچے اور پھر حیدرآباد آ بسے۔

جب وہ پاکستان وارد ہوئے تھے تو انھوں نے اپنا نام سرحد پار کرتے ہی چھوڑ دیا تھا اور اپنے نام کا وہ لاحقہ، جو، اُن کی خوشنما تحریر اور غیر مبہم نثر نگاری کی وجہ سے انہیں ملا تھا "نجم الانشاء" اپنے نام کے طور پر اپنا لیا اور حیدرآباد میں اپنے ساتھ لائی ہوئی پونجی سے ہیرآباد کے علاقے میں ایک چھوٹا سا مکان جس میں محض ایک کمرہ اور اس کے آگے ایک برآمدہ اور صحن

تھا خرید لیا۔

اور پھر نجم الانشاء نے حیدرآباد کے بڑے ڈاک خانے کی سیڑھیوں پر جو اتنا بڑا ڈاک خانہ نہیں تھا جتنا اس کا نام تھا، نہ اس کی قابلِ ذکر بڑی عمارت تھی بس وہ ایک ایسی عمارت تھی اندر سے اندھیری اور باہر سے دبی ہوئی اس کو حیدرآباد کا جنرل پوسٹ آفس کہا جاتا تھا۔ کاغذ قلم دوات لے کر لوگوں کے خطوط لکھنے کے کام کو اپنا کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے بچپن میں تختی لکھی تھی اس لیے لفظوں کی نوک پلک ان کے ہاتھوں سے خوب صورت اور بہتر ہو جاتی کہ کم پڑھا لکھا بھی سمجھ لیتا۔ صحیح اور درست لفظوں سے جملوں کی ترتیب اُن کا ہنر تھا، مختصر جملوں میں وہ دکھڑے جو لوگ اُن کو سناتے وہ لکھ دیتے۔ اس وقت بیشتر لوگ ہندستان سے آتے ہوئے اپنے رشتہ داروں اور پیاروں کو جنہیں وہ اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے خطوط لکھواتے تھے۔

اولاد نہ ہونے اور کوئی رشتے ناتے والے نہ ہونے سے اُن سے اُن کے خواب اور خواہش محض اپنے بڑھاپے کو خوش اسلوبی سے گزار دینے کی حد تک محدود تھے، خطوط نویسی انھوں نے وقت گزاری اور اپنے بعض شوق پورے کرنے کے لیے اختیار کی تھی۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے کی خُو دونوں میاں بیوی میں تھی۔ وہاں کے بڑے مکان اور آرام و آسائش کو وہ بھول چکے تھے اور دوسری تمام ضرورتوں کو بھلا کر اپنے اپنے جسم و جاں اور ذہن کی لذّت یابی کے شوق کو اپنا کر بیٹھ رہے تھے۔

نجم الانشاء کو بہترین حُقّہ اور اُس کے لیے اعلا درجے کے لکھنوی خمیروں کی تمباکو چاہے وہ کتنی ہی گراں کیوں نہ ہو منگوانے کی عادت تھی۔ جب وہ حُقّہ پیتے تو تمام گھر خوشبو سے مہک اُٹھتا۔ وہ اخبار، رسائل اور جرائد کے رسیا تھے ہر روز ڈاک سے پارسل اور وی پی آتے اور ملک کے گوشے گوشے سے وہ کتابیں منگواتے۔ اُن کی بیوی بھی اچھی چیزوں، بہترین کپڑوں، بے نظیر خوشبوؤں، اچھے پان اور اس کے لوازمات کی عادی تھیں۔ پان کے لیے اُن کا

کتھا چونا مخصوص ہوتا، کتھا باہر سے منگوایا جاتا اس کو مخصوص طریقے سے پانی میں گھولا جاتا پھر اس کو پکایا جاتا اور ایک بڑے خوان میں اُپلوں کی چھنی ہوئی راکھ کا ڈھیر لگا کر اس پر موٹے ململ کا کپڑا بچھا کر اس پکے ہوئے کتھے کو اس پر پھیلا دیا جاتا اور وہ جب سوکھ کر باریک پپڑی کی صورت اختیار کر لیتا تو اس کو رکھ لیا جاتا اور وقتِ ضرورت کیوڑے میں اس کو گھولا جاتا۔ چونے میں زعفران اور بالائی ملا کر شامل کیے جاتے۔ چھالیہ کے ساتھ چھلکے اُترے ہوئے بادام کترے جاتے۔ مراد آبادی قوام اور کاغذی الائچی کے ساتھ جب پان بنا کر کھاتے جاتے تو اس کی خوشبو دالانوں دالان پہنچتی۔

اب یہاں آکر بھی حتٰی المقدور یہ انتظام کیا جاتا لیکن یہ انتظام اُن کی نازک مزاج خواہش کے مطابق نہ ہوتا۔ نجم الانشاء کے حُقّے اور اس کے لیے تمباکو کی خواہش کے مطابق نہ ہوتا۔ نجم الانشاء کے حُقّے اور اس کے لیے تمباکو کی خواہش اور طلب بھی ویسی ہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی خواہشوں کو بڑی محنت سے پورا کرتے اور لطف اندوز ہوتے۔ اُن کی بیوی عمر رسیدگی کے باوجود کانوں، گلے اور بالوں میں موتیا کے پھول اور کلیاں اب بھی پہنا کرتی تھیں، کپڑے صاف ستھرے اور خوشبو میں بسے ہوتے، دو پٹہ کلف لگا کر خود چُن کر اوڑھتی تھیں۔ موسم بدلتا تو لباس خوش بُو اور پھُول بھی بدل جاتے شام کو وہ بن سنور کر پلنگ پر چھوٹے سے صحن میں بیٹھ کر چھالیا اور بادام کترتی رہتیں اور نجم الانشاء حُقّے کی نَے منہ سے لگائے آدھی آدھی رات تک پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹکے کتابیں، رسائل اور اخبار پڑھتے رہتے اور پھولوں کی مہک اور خوشبودار خمیرے کے تمباکو سے، قوام، الائچی، زعفران اور کیوڑے کی لہریں اس چھوٹے سے مکان کے صحن اور دالان کو معطّر رکھتیں۔

دونوں میاں بیوی میں محبت اور رفاقت کا ایسا رشتہ اور تعلق تھا کہ گھنٹوں ایک دوسرے سے نہ بولنے کے باوجود وہ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات اُن اَن دیکھی لہروں کے ذریعہ سے آگاہ ہوتے رہتے جو اُن کے آس پاس ایک

روحانی محبت کا ہالہ بنائے رہتی تھیں۔

نجم الانشاء نے حیدرآباد میں چند اچھے سندھی دوستوں سے راہ و رسم رکھی ہوئی تھی، ایک طرف اگر وہ حیدر بخش جتوئی سے ملتے تھے تو دوسری طرف ڈیپلائی سے بھی اُن کی یاد اللہ تھی ڈاکٹر ابراہیم بھی اور مولانا گرامی بھی اُن سے ملنے کا شوق رکھتے تھے۔ وہ حافظ مبارک علی شاہ کی موتی محل کی محفلوں میں بھی اکثر شریک ہوتے اور قاضی اکبر اور میر رسول بخش تالپور اور میر علی احمد تالپور سے بھی اُن کی نیاز مندی کا سلسلہ تھا، اُن کی نگاہ دوررس نے جان لیا تھا کہ اس صوبے کی زبان ہی سندھی نہیں تہذیب جن قدیم کھوئی ہوئی تہذیبوں کے جلو سے نکلی ہے وہ اپنی راہ کو بدلنا نہیں چاہتی، اس کی معاشرتی عمارت بھی قدیم رسم و رواج اور فکر کے اس آمیزے سے تیار ہوئی ہے جس کی وجہ سے اس قدیم تہذیب کی بو باس کسی اور بو باس کو قبول نہیں کر سکتی۔ عوامی سطح پر اس پر اگر باہر سے آنے والی تہذیبوں کے جو چھینٹے پڑتے ہیں وہ اس میں ہی ضم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف سندھی بولنا سیکھا بلکہ سندھی لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا۔ ڈیپلائی نے تو اُن کو اپنے ساتھ تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگانا چاہا لیکن وہ تیار نہیں ہوئے۔ وقت گزرتا رہا، میاں بیوی دونوں بڑھاپے کی آخری سرحدوں کی طرف بڑھتے رہے اُن کے ہاتھ پاؤں سلامت، صحت و تن درستی اچھی تھی محدود خواہشات اُن کی توانائی کو ختم نہ ہوتے دیتیں۔ ان کے اندر ان کے مزاج کی سدا بہار تازگی زندگی کے لیے قوت و اعتماد فراہم کرتی رہتی لیکن یہ باہر کا موسم جو لوگوں کے مزاج سے بنتا اور بگڑتا ہے بدلتا رہتا۔ سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ نعرے بھی بدلتے رہے جس کی وجہ سے بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں اب اکثر ان کو اداس کرنے لگی تھیں۔

نجم الانشاء ڈاک خانے کی سیڑھیوں پر خط و کتابت کے بعد اپنے جن دوستوں میں اکثر چلے جاتے وہ سب کے سب صاحب فہم تھے علاقائی تعصب اور غیریت کے آزار سے محفوظ اور یک جہتی فکر و عمل کی اہمیت سے واقف اور انتشار فکر و اظہار سے اپنے ذہنوں کی پاکیزگی کو آلودہ نہیں کرتے تھے۔ جب کبھی محفل جمتی اور نجم الانشاء اردو سندھی میں ملی جلی گفتگو کرتے تو سب چپ ہو کر

ان کی باتیں سنتے۔ سیاسی گفتگو بھی ہوتی لیکن نجم الانشاء اس میں دخل نہیں دیتے ان کو محسوس ہونے لگا تھا کہ محض چند سال پہلے کی باہمی شفقت اور رفاقت کی خوشبو اب کم ہوتی جاتی ہے اب معاشی اور اقتصادی ضرورتوں اور خواہشوں کے حصول کی گونج باتوں میں زیادہ در آئی تھی اور آنے والے لوگوں کو اس بڑھتی ہوئی تکالیف اور معاشی بدحالی کا موجب قرار دیا جاتا جب ایسا ہوتا تو نجم الانشاء کہتے "سائیں ہم تو پناہ گیر بن کر آپ کے پاس آئے ہیں، آپ کے مہمان ہیں آپ کا یہ فکر کہ ہم آپ کی معاشرت، ثقافت اور معیشت کی روایات کو بگاڑے دے رہے ہیں درست نہیں۔ اب کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ انسانی آبادی ہمیشہ اِدھر سے اُدھر ہوتی رہی ہے۔ کوئی انسانی گروہ صحرا اور سمندر پار کر کے زیادہ وسیلے رکھنے والے گروہ کے پاس آبسا اور کہیں کوئی گروہ پہاڑوں پر چڑھ کر صاف اور وافر چراگاہوں کے کنارے آباد لوگوں میں آکر گھل مل گیا۔ شروع شروع میں تو گروہی اجنبیت رہتی ہے لیکن انسان پھر انسان ہے یہ اجنبیت دور ہو کر نئی رفاقتوں میں تبدیل ہو جاتی ہے، ہم کو وقت تو دیجیے چھوٹے گروہ بڑے گروہوں میں گھل مل کر اور بڑی تہذیب چھوٹی تہذیب کو اپنے سائے میں لے کر ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہیں گے۔ ہمارے اور آپ کے تجربات اور ضرورتیں ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک عظیم تر گروہ کی صورت میں مستقبل کے نئے افق روشن کریں گی" کوئی دوست یہ سن کر جواب دیتا۔

"نہیں صاحب۔ یہ صورت آپ کو اس لیے نظر آتی ہے کہ آپ نجم الانشاء صاحب صاحبِ اولاد نہیں ہیں اس لیے آپ کو اپنی اولاد کو کوئی مستقبل منتقل نہیں کرنا ہے، آپ حال میں زندہ ہیں اور اپنی زندگی کے آخری دنوں کو آرام سے گزار دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے آپ کا اندازِ فکر ہے یہ! لیکن ہماری اولادیں تو نئی خواہشات، نئے مطالبات اور نئے تقاضے لے کر ہمارے سامنے صف آرا ہو رہی ہیں وہ اپنے حقوق میں دوسروں کی شمولیت کے لیے تیار نہیں ہم اُن کا کیا کریں؟"

بات درست ہوتی، نجم الانشاء سن کر چپ ہو جاتے اور اُن کے ہونٹوں سے سرد آہوں

کا دھواں فضا میں بکھر جاتا اور وہ یہ سوچ کر ملول ہو جاتے کہ واقعی ان کا تو کوئی مستقبل ہی نہیں ہے۔

کچھ سال بعد اب یہ صورتِ حال ہوئی کہ آنے والے لوگوں کی اولاد کو بھی اپنے مستقبل، معاشرت، تہذیب و تمدن اور زبان کا خیال آیا۔ پہلے یہ احساس دلوں میں رہا پھر اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی دیواروں تک محدود رہا۔ پھر دونوں طرف شور بلند ہوا اور بالآخر سڑکوں تک آ پہنچا۔"

اُن کے باہر کی تبدیلی کو انھوں نے اپنے ذہن اور فکر کو آلودہ کرتے ہوئے محسوس کیا سامنے آج ڈاک خانے کے چھجّے اور روشن دان پر کبوتر بھی خاموش تھے، پَر سمیٹے بیٹھے تھے۔ ڈاک خانے میں چہل پہل آج کم تھی۔ نجم الانشاء کا دل بوجھل ہو نا گیا آج کوئی بھی خط لکھوانے نہیں آیا تھا۔ اب تو پرانے آنے والوں کی اولادیں بھی پڑھ لکھ گئی تھیں بوڑھے ختم ہو رہے تھے جو، جوان آتے تھے وہ ادھیڑ ہو کر بعض معاملات میں زیادہ غصیلے اور ترش رو ہو گئے تھے۔ ملازمتوں کے حصول میں ناکامی اور کاروبار میں مقابلوں کے اضافے نے ان کو گروہ بند کر دیا تھا۔ "یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟" انھوں نے سوچا "شاید اب ہم کو ان کبوتروں کی طرح کہ جو پہلے یہاں تھے اور جن کی اولادوں کو وہ اپنی جگہیں دے کر ستدھ یونی ورسٹی کی قدیم عمارت کی پہنائیوں میں جا چھپے کچھ نے اور قدیم عمارتوں، مقبروں میں پناہ لے لی، کیا، ہیں بھی ۔ ؟ ہاں ایک دن تو یہ آتے گا ہی لیکن ہم اپنی تمنّاؤں کی مالائیں کس کے گلے میں ڈال کر اسے اپنا گدی نشین بنا جائیں گے ۔ ؟ یہ درست ہے ہم تو ان میں سے ہی کسی کو اپنے مستقبل کی روشنی بنانا چاہتے تھے ؟ لیکن !"

واپس جانے کے مقررہ وقت سے پہلے نجم الانشاء نے اپنا تھیلا سنبھالا اور گھر کی طرف چل دیئے۔

گھر جانے سے پہلے اُن کے کچھ معمولات تھے جن میں وہ فرق نہیں آنے دیتے تھے، وہ

بڑے ڈاک خانے سے پیدل چلتے ہوئے ریشم گلی سے گزر کر اور دوسری گلیوں کو پھلانگتے ہوئے یا کبھی سیدھے گاڑی کھاتے سے ہوکر ریڈیو پاکستان کی پرانی عمارت ہوم اسٹیڈ ہال کی چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ قلعہ کے چوراہے پر پہنچتے۔ جہاں سے وہ بیوی کے لیے موتیے کے پھول یا موسم کے اعتبار سے دستیاب دوسرے پھول لیتے، پھر پان لیتے اپنے لیے تمباکو اور کبھی کبھار ربڑی بھی لے لیتے۔ آج جب وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گاڑی کھاتے سے ہوکر قلعے کے چوراہے تک پہنچنا چاہ رہے تھے تو نہ جانے کیوں ان کو فضا میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا، حالاں کہ چہل پہل ویسی تھی جیسی روزانہ ہوتی ہے لیکن اداسی کا حبس سا بڑھتا جا رہا تھا۔

انھوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ آج ربڑی بھی لی وہ سب سامان لیتے ہوئے سیدھے شاہی بازار سے گزر کر ہیر آباد پہنچنا چاہتے تھے کہ "تڑ تڑ" ۔ گولیوں کی آواز آئی اور ان کے بازو میں تھما ہوا وہ تھیلا گر گیا جس میں ان کے لکھنے کا سامان تھا اور ان کے بازو میں آگ کا شعلہ سا اُترتا چلا گیا۔ دل کو مجروح کر دینے والے ایک نہایت تکلیف دہ شور کے ساتھ لوگوں کی کراہیں بلند ہوئیں اور موٹر سائیکلوں کے شور کے ساتھ بھاری اور تیز رفتار گاڑیوں کا شور بھی کہیں سے پھوٹ بہا۔ نجم الاشاعدنے گرتے گرتے دیکھا کہ ان سے کچھ فاصلے پر کچھ اور لوگ بھی یا تو ساکت پڑے ہیں یا تڑپ رہے ہیں اور وہ چوراہا جو ابھی خوب صورتی اور خرید و فروخت کے شور سے بھرا ہوا تھا، اب اس کی زمین پر خون ہی خون بہہ رہا تھا۔ انھوں نے کراہتے ہوئے اپنے زخمی ہاتھ کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ انھوں نے لیکن دوسرے ہاتھ سے اس تھیلے کو سنبھال لیا جس میں اُن کی بیوی کے لیے انھوں نے پھول اور پان لے کر رکھے تھے۔

یکایک اُن پر ایک شدید قسم کی کم زوری اور پھر ایک ان جانی سی غنودگی طاری ہوتی چلی گئی۔ انھوں نے بند ہوتی آنکھوں سے خود پر ایک جانے پہچانے چہرے کو جھکتے دیکھا۔ یہ ان کے قریب ہی ہیر آباد میں رہنے والا ایک مقامی نوجوان تھا۔ انھوں نے اس سے گھر پہنچا دینے کی استدعا کی۔

"پہلے آپ کو ہسپتال لے جانا ضروری ہے۔" اس نوجوان نے ایک دوسرے نوجوان کے سہارے اُن کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ بولے "نہیں ۔ گھر! بیوی پریشان ہوں گی۔"

اب اُن کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی اور آنکھوں کے ساتھ ساتھ اُن کا ذہن بھی اندھیرے میں ڈوب گیا۔

کسی طرح اُن کی بیوی تک یہ اطلاع پہنچی کہ قلعہ کے چوک میں گولی چل گئی ہے نقاب پوشوں نے حملہ کرکے بہت سے لوگ مار ڈالے ہیں۔ نجم صاحب کو لوگ ہسپتال لے گئے ہیں وہ زخمی ہوئے ہیں۔ یہ سن کر اُن کی بیوی جو اپنے شوہر کے بغیر نہ کبھی گھر سے نکلی تھیں اور نہ کہیں اُن کو وہ چھوڑ کر جا سکتی تھیں، بہت پریشان اور بدحواس ہوگئیں۔

"لیاقت ہسپتال میں ہی اُن کو لایا گیا ہے۔" کسی کی یہ بات اُن کی بیوی کے کانوں سے ٹکرائی اور کسی نے کہا۔

"یہ تو یہاں سے قریب ہی ہے۔"

"مجھے لے چلو۔ مجھے لے چلو۔" وہ بوکھلا کر چیخنے لگیں۔

محلّے کے چند بچّوں اور عورتوں کے ہمراہ برقعہ سر پر ڈال کر وہ گرتی پڑتی ہسپتال پہنچیں۔

ہسپتال میں ایک شور ہنگامہ اور افراتفری مچی ہوئی تھی، وہ یہ سب دیکھ کر گھبرا گئیں کہیں کوئی زخمی چیخ رہا تھا، کوئی سسکیاں لے رہا تھا، اور خون تھا کہ فرش پر پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے یہ سب کچھ زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ خون اور اس ماحول کو دیکھ کر چکرا گئیں اور گھبرا کر سامنے والے اُس ستون سے جا ٹکرائیں جو اس ہسپتال کی چھت کو تھامے رکھنے والے ستونوں میں سے ایک تھا۔ اُن کی پیشانی کے ستون سے ٹکراتے ہی اُن کی پیشانی سے خون پھوٹ پڑا اور اُن کے منہ سے نکلا "وکیل صاحب ۔ وکیل صاحب۔" وہ نجم الاثشاء کو اسی نام سے پکارتی تھیں۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑیں "وکیل

صاحب" کی آواز کی گونج ان سے چند گز فاصلے پر نیچے فرش پر رکھے ہوئے ایک اسٹریچر پر پڑے انسان کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ نجم الانشاء تھے جو اپنی باری پر علاج اور زخم ٹھیک کرنے یا آپریشن کے لیے یہاں لاکر رکھے گئے تھے۔ یہ سنتے ہی انھوں نے اپنی طاقت جمع کر کے پوری قوت سے جو نحیف آواز کی صورت میں نکلی پکارا۔ "بیوی۔ بیوی"۔ نجم الانشاء اپنی بیوی کو کہہ کر مخاطب کرتے تھے ستون سے ٹکرا کر گرنے والی بیوی کے حواس تک پہنچنے والا نجم الانشاء کا یہ آخری رابطہ تھا۔

پھر نہ کوئی رابطہ رہا نہ تعلق کہ وہ دونوں اپنے مستقبل کو کھو چکے تھے۔ دونوں جسم جانے کہاں لے جاکر دفن کیے گئے۔ ان دونوں کا کوئی مستقبل نہیں تھا اور نہ کوئی ان کے ماضی کا وارث کہیں موجود تھا! اور کبوتر مقبروں کی ممٹیوں پر تو اپنے بسیرے کر لیتے ہیں کھلے آسمان تلے بے آسرا زمین میں دھنستی چلی جانے والی قبروں کے تو وہ آس پاس بھی نہیں آتے۔!!!

(۱۹۸۹)

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب!

میں الفنسٹن اسٹریٹ کے (جس کو اب زیب النساء اسٹریٹ کہا جاتا ہے) اس گوشے پر کھڑا ہوا تھا جو مرینا ہوٹل کے سامنے سے شروع ہوتا ہے، کچھ قدم دور وہ عمارت تھی جو کبھی زرد پتھروں پر ایک لانبے اور بڑے برآمدے پر مشتمل تھی اور اس کے برآمدے کے اندر ایک مشہور ڈرگ اسٹور تھا۔ اس برآمدے کے دونوں طرف گُل فروش بیٹھا کرتے تھے۔ ہار بنا کر بیچنے والے نہیں خوب صورت گُل دستے بنا کر فروخت کرنے والے۔ میں اس فوّارے کے چوراہے سے چل کر یہاں تک آیا تھا، جو کبھی گانے اور گنگنانے والے فوّارے کے نام سے مشہور تھا اور اب بے نغمہ و آہنگ فوّارے کی صورت میں خشک حالت میں اس طرح اداس ہے، جیسے اس کے نغمے کوئی چُرا کر لے گیا ہو۔ اب تو اس کے سامنے والا مشہور سینما گھر بھی ضروری تقریبات کے ہال میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے جب میں وہاں سے چلا تو خود بھی اداسی کی ہلکی پھُوار میں بھیگ چکا تھا، دماغ سُن تھا اور ذہن اداس! اور اس چوراہے پر پہنچ کر آگے نگاہیں اُٹھائیں تو وہ زرد پتھر والی عمارت بھی اب وہاں نہیں تھی نہ وہ گل دستے فروخت کرنے والے تھے اور نہ ہی خوش جمال اور نازک اندام خواتین گُل دستے خرید رہی تھیں۔

فوّارے سے روانہ ہونے سے قبل ہی زمان و مکاں کے فلسفے میں الجھا ہوا تھا، زمانہ تو تیز چکّی کی صورت گزر رہا تھا، جس چکّر کو ہم دیکھ رہے تھے وہ ہمارے اجداد نے نہیں دیکھا تھا اور جس چکّر کو انھوں نے دیکھا تھا وہ ہم نے نہیں دیکھا اور آنے والے لوگ آج کے چکّر

کی تصویر نہیں دیکھ سکیں گے ۔ مکان کی ہئیت تبدیل ہوتی رہے گی ۔ انسانی فکر نئی دریافتوں
سے آشنا ہوتی رہے گی ۔

اب وہ شخص جو ریٹائر ہو چکا ہو ایسی ہی باتیں سوچا کرتا ہے ۔ میں بھی ابھی چند سال
پیشتر ہی ریٹائر ہو کر کراچی میں اپنے اس گھر میں آکر بس گیا ہوں جس میں میری محبوب بیوی او
ہمارے بچے سب ایک ساتھ رہا کرتے تھے ۔ بچیاں شادی ہو کر اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں او
اُن کے شوہر اُن کو دوسرے ملکوں میں لے جا کر آباد ہو گئے اور لڑکے بھی باہر کے ملکوں ہی میں ج
بسے اور اُن کی ماں بھی ، کبھی کسی ایک بچّی کے پاس کبھی دوسری بچّی کے پاس رہ رہی تھیں ۔
بہوؤں سے اُن کی بنتی نہیں تھی ۔ میں کہ جو اس کے سہارے پر ہی زندہ رہتا رہا تھا اب اس
کی یادوں کو دل میں بسائے زندہ مگر تنہا پھرتا رہتا تھا ۔ لیکن تھی اب بھی وہی میرا سہارا ۔ نظر
دور مگر دل میں بسی ہوئی ۔ مجھے ماضی یاد آ گیا ۔ وہ جوانی کے دن تھے ۔

ایک دن جب اپنے اعلا افسر کی ایک کامرانی پر اس کو اس کے پسندیدہ پھولوں ک
گل دستہ خریدنے کے لیے اس ورانڈے میں پہنچا تو میرے اور اس کے ہاتھ اسی گل دستے پر پہنچے
میں نے اس کو اور اس نے مجھے دیکھا ۔

" اُف خدایا ! " " یہ کیسے ممکن ہے ؟ " اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں کانپ گیا اور و
ایک لمحہ ، وہ ایک ثانیہ مجھے اپنی نوجوانی کے اس زمانے تک لے گیا جب میں نے اس کو ایک
اور حال میں دیکھا تھا ۔ میں نے اپنا ہاتھ واپس ہٹا لیا ۔ اس نے نہایت ممنونیت سے مجھے دیکھ
۔ بعد میں ۔

لیکن میں آپ کو ماضی کی وہ کہانی تو سنا دوں جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی
ہمارے قصبے سے جنگلات کچھ دور نہیں تھے ۔ میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ اکث
شکار کو جایا کرتا تھا ۔ ہم لوگ سائیکلوں پر بندوقیں لے کر جاتے اور جنگل میں پہنچ کر اپنی سائیک
لوہے کی زنجیروں سے کسی مضبوط درخت سے باندھ کر تالے لگا دیتے ۔ ان جنگلوں میں چھپ

ہرن جن کو وہاں کے علاقے میں "چکارہ" کہتے تھے شکار کرتے اور شام تک واپس آجاتے۔ برسات کے موسم میں جب بادل تو تھے مگر برسنے والے بادل نہیں تھے ہم دونوں کو شکار کی سوجھی، اور سائیکلوں پر سوار ہو کر ہم روانہ ہو گئے اپنے پسندیدہ درخت سے سائیکلیں زنجیروں سے جکڑ کر تالے لگائے اور شکار کی ٹوہ میں چل دیے۔ ہمارے روانہ ہوتے ہی سورج نے ہلکے بادلوں کی ردا سے اپنا چہرہ نکالا، ہلکی دھوپ نہایت بھلی لگنے لگی۔ ہمارے تجربے کے مطابق اس وقت چکارے پہاڑیوں کے اوپر ہوتے چاہئیں تھے۔ چناں چہ ہم پہاڑیوں کی سمت چل پڑے۔

آج نہ جانے کیا بات تھی کہ پہاڑیوں کی سطح مرتفع پر پھیلے ہوئے سبزہ زاروں پر چکارے نہیں تھے۔ جب ہم کچھ تھک گئے تو سستانے کے لیے ایک درخت کے نیچے وہاں پڑے ہوئے بڑے پتھروں پر بیٹھ گئے اور اپنی فلاسک سے چائے پینے لگے۔ یکایک میرے ساتھی صفدر میاں کی نظر دور ایک چکارے پر پڑی اور وہ بندوق سنبھال کر ادھر چل پڑے اور مجھ کو فلاسک اور تھیلہ سنبھالنے کی ہدایت کرتے ہوئے ادھر آنے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد میں ادھر پہنچا تو نہ صفدر میاں نظر آتے نہ چکارہ۔ کچھ دیر میں وہاں ادھر اُدھر دوربین سے انہیں تلاش کرتا رہا۔ وہ شاید پہاڑ کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر نیچے جنگل کی گھنی جھاڑیوں میں جا اترے تھے۔ میں ایک اندازے کے مطابق آگے بڑھتا رہا نیچے جنگل برسات کے موسم کی وجہ سے چھوٹے پودوں، سبزے اور کانٹے دار جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا میں نہ جانے کتنی دور، اُن کی تلاش کی دھن میں پہنچ گیا تھا کہ یکایک بادل کی تیز کڑک سنائی دی، اور چند منٹوں کے بعد ہی یکایک تیز بارش شروع ہوگئی۔ گو میں اس جنگل سے واقف تھا لیکن یکایک بارش نے کچھ ہراساں کر دیا۔ اوپر نگاہ اُٹھا کر ایک صاف مقام سے آسمان کی طرف دیکھا تو گہرے بادل نہ جانے کہاں سے بڑی تیزی سے گھر کر آگئے تھے۔ شکار کے تجربے نے بتا دیا کہ اب کسی محفوظ مقام پر پناہ لینی ہوگی۔ صفدر میاں کو تلاش کیے بغیر جانا اصول کے خلاف تھا۔

ایک جگہ گھنی جھاڑیاں تھیں، جن کے نیچے بیٹھا جا سکتا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا اور سولا ہیٹ پر میں نے اپنی برساتی ڈال لی۔ یہ سب چیزیں ہمارے شکاری تھیلے میں ہوتی تھیں۔ کافی وقت گزر گیا، مجھے حبس کا بہت دیر بعد احساس ہوا، اور ایک گھبراہٹ مجھ پر طاری ہونے لگی۔ جب ذرا بارش ہلکی ہوئی تو میں نے صفدر میاں کو زوردار آوازیں دیں لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا، اپنی ہی بازگشت سنائی رہی۔ میں گھبرا کر واپس اسی سمت جانا چاہتا تھا جدھر سے میں اور صفدر میاں جدا ہوتے تھے کہ میں نے دور ایک ہیولے کو دیکھا جو بارش کی وجہ سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے تھیلے سے دوربین نکال کر آنکھوں سے لگائی

"یا اللہ یہ کیا ؟" میں نے سہمے ہوئے انداز میں دل میں اس جملے کو دہرایا۔ سامنے ایک برہنہ جوان لڑکی جس کے زانو سے اوپر ناف تک ایک چیتھڑا سا بارش کے پانی کی وجہ سے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ سیاہ بدن پتھر کی طرح ترشا ہوا، برہنہ سینہ طویل گردن۔

"یہ کوئی چڑیل ہو سکتی ہے ؟" میں نے دل میں پھر سوچا کہ ابھی ذہن سے بچپن کی سُنی ہوئی ایسی کہانیوں کا خیال دل سے نہیں نکلا تھا میں نے دوربین سے اس کے پیروں کی طرف دیکھا۔ اس کے پنجے سیدھے تھے۔ میں نے اس کی طرف دوربین سے دیکھتے ہوئے اس کے ایک ایک عضو کے جائزے کی لذت حاصل کی، وہ اب آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں پہلے تو خوفزدہ ہوا لیکن پھر بندوق کی موجودگی کی وجہ سے جو لوڈ تھی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب وہ زیادہ قریب آگئی تو میں نے دوربین گلے میں لٹکا کر اس کی طرف بندوق تان لی۔ اب اس کے لانبے لانبے بال ہلکی پھوار کی ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ بندوق کی وجہ سے وہ وہیں رک گئی اور عجیب سی زبان اور آواز میں اُس نے کچھ کہا، میں صرف یہ سمجھ سکا۔

"نہ۔ نہ" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے اس کی اس عاجزی کو دیکھ کر اسے قریب آنے کے لیے اشارہ کیا اور خود بھی اس کی طرف بڑھا وہ گوشت پوست کی ایک نوخیز و نوجوان سیاہ چمکیلی لڑکی تھی اس کے جسم کی تپش پانی کی پھوار میں دھواں سا بن کر اٹھ

رہی تھی اب میں نے محسوس کیا کہ بندھیاچل کے پہاڑی حصوں کے عمیق علاقوں میں بسنے والی "بھیل" قوم کی کوئی لڑکی تھی وہ لوگ برہنہ ہی رہتے ہیں۔ میں نے اس سے ڈپٹ کے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ کیا چاہتی ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ میری کہی ہوئی بات اور اس میں موجود غصے کو جان گئی ہے اس نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کے نامکمل اور کچھ کچھ سمجھ میں آنے والے لفظوں سے میں نے جانا کہ اس کو کسی معاملے میں میری مدد درکار ہے، وہ ایک سمت اشارے بھی کر رہی تھی۔ میں نے سوچا وہ کوئی چال نہ چل رہی ہو، ممکن ہے اس کے قبیلے کے لوگ کہیں قریب ہی چھپے ہوں اور میرا سامان ہتھیانا چاہتے ہوں، ممکن ہے یہ بھوکی ہو۔ میں نے تھیلے میں سے چنے اور بسکٹ نکال کر اس کو دینے چاہے۔ اس نے ان کو نہیں لیا۔ بس وہ مجھے ایک سمت اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتی رہی، میں نے بہرحال ہمت کر کے اس کو اپنے آگے رکھ کر اور بندوق کی نال اس کی سمت کر کے چلنے کا اشارہ کیا۔

"اللہ کی پناہ کیا ٹھوس اور جوان جسم کی کالے پتھروں کی ترشی ہوئی وہ چلتی ہوئی قد آدم مورتی تھی۔"

یکایک اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب ایک خونخوار سی بلی کی آنکھوں والی چمک کی تیز چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ وہ مڑی اور سامنے ایک گہرے گھنے اور اندھیرے درختوں کی چھاؤں کی طرف بڑھی۔ درختوں کے گھنے جھنڈ پر میری نگاہ اٹھی اور اس کا بدن اور وجود نگاہوں سے دور ہوا اور جب پلٹ کر میری آنکھوں کا زاویہ ادھر ہوا تو وہ لڑکی سامنے نہیں تھی۔ میں کچھ حیران خوفزدہ اور پریشان ہونے والا تھا کہ ایک کالی۔ بالکل سیاہ بلی اسی جگہ مجھے نظر آئی، جہاں میری آنکھوں کے دائرے سے وہ کالی لڑکی غائب ہوئی تھی اب وہ بلی آہستہ آہستہ گھنے درختوں کے گھستے ہوئے جھنڈ کی طرف بڑھ گئی۔ میں جھجکنے اور ڈرنے لگا تو وہ تھم گئی اور مڑ کر میری طرف اس نے دیکھا۔ اب مجھے ان جانے خطروں کا احساس ہوا یکایک میرے کانوں میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ کالی بلی دو قدم آگے بڑھی اور میری جھجک دیکھ کر

رک گئی اور مجھے ایسی آواز آئی جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

"ڈرو نہیں بابوجی۔ آگے چلے آؤ۔" یا شاید یہ اس کی آنکھوں سے نکلنے والی شعاعوں کی ریڈیائی حرکت تھی جس نے یہ جملہ میری قوتِ سماعت تک پہنچایا۔ اب میں کچھ مسحور سا ہو کر اُدھر اس کالی بلّی کے پیچھے چل رہا تھا۔ کچھ دُور جا کر کراہنے کی ایک تیز آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی میرے آگے چلنے والی سیاہ ننگی دوشیزہ نے کہ جو، اب ایک سیاہ بلّی کا روپ بدل چکی تھی ایک چھلانگ لگائی اور نگاہوں سے اوجھل ہوگئی میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ چند لمحوں کے بعد کوئی بوڑھا کھانسا اور اس نے رُک رُک کر اس علاقے کی دیہی زبان میں کہا۔

"ڈرو مت بابوجی! سامنے والی دبنگ جھاڑی کے نیچے چلے آؤ۔" میں نے بڑھ کر دیکھا۔ ہاں! وہاں ایک جھونپڑی تھی، پتّوں سے ڈھکی ہوئی اور پتھروں سے بنی ہوئی۔ میں نے بندوق ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لی اور پہلے اوپر درختوں پر گہری نظر ڈال کر ایک ایک شاخ کو دیکھا اور پھر اس جھونپڑی کے نچلے سے دروازے میں داخل ہونے کے لیے اپنے گھٹنوں پر جھک گیا۔ بس اسی وقت پھر ایک مرتبہ وہ کالی پتھروں سے تراشی گئی لڑکی اپنی تمام رعنائیوں اور آنکھوں میں کچھ ملائم اپنائیت لیے ایک جھلک دکھلا کر غائب ہوگئی۔!

اور پھر ایک عرصے بعد میں نے ان آنکھوں کی چمک اور چاہت کو اور اس چہرے کو زیب النساء اسٹریٹ کی اس پیلی بلڈنگ کے ورانڈے میں دل پسند پھولوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر میری طرف گردن گھماتے ہوتے دیکھا!

اور پھر یہی خاتون آگے چل کر میرے بچّوں کی ماں بنی اور اب دوسرے شہروں میں وہ اپنے بچّوں کو اُس بلّی کی طرح پکارتی پھرتی ہے جن کو کوئی اٹھا کر لے گیا ہو کتنی دردناک آواز ہوتی ہے اُس ماں کی، اُس بلّی کی جس کے بچے کوئی اُٹھا کر لے گیا ہو یا کسی بلّے نے چبا ڈالے ہوں۔ یہ وقت اور اُس کے تقاضے ہمارے اولادوں کو کس طرح ہم سے جدا کر رہے ہیں زمانہ، وقت اور لمحے ہمارے۔ ہم انسانوں کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں وقت بدلتا ہے۔

کبھی صبح شام کبھی دوپہر۔ اور زمین کی گردش موسموں کو ہمارے آس پاس، ہمارے سر پر مسلط کرتی رہتی ہے۔ جو خود وقت، زمانہ اور لمحات کا کھیل ہیں۔ موسموں میں جب برسات کا موسم آتا ہے تو کراچی، غم واندوہ کا شکار ہو جاتا ہے مگر میرا دل سرور و سرشاری سے بھر جاتا ہے ایک اُمنگ اور احساسِ پُرشوری مجھ میں جاگ اُٹھتا ہے۔

ارے! میں نے آپ کو اپنی نوجوانی کی ایک الف لیلوی برستی بھگوتی، دل کو برماتی دوپہر کا پورا قصہ تو سنایا ہی نہیں۔!!

تو ہوا یوں، کہ جب میں اِس جنگل میں کبھی کالے پتھر سے تراشی ہوئی جلتی پھرتی گوشت پوست کی مُورتی اور کبھی سیاہ بلّی کا روپ دھارنے والی عجیب مخلوق کے پیچھے کہ جو اپنی آخری جھلک دکھا کر غائب ہوئی تھی اس جھونپڑی میں داخل ہوا جہاں سے کسی بوڑھے کے کراہنے کی کی آواز آ رہی تھی تو میں نے دیکھا۔ ایک قطعی بانس کی کھپچیوں کی طرح سُوکھا ہوا بوڑھا گھاس پر پڑا ہے۔ سیاہ رنگ، نیلی آنکھیں! اس نے مجھے دیکھ کر ٹوٹتی سانسوں میں اُبھرتی ڈوبتی بے ڈھنگی آواز میں کہا کہ۔

"بابو جی! میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ میں اس وقت اپنی زمین سے بہت دور ہوں، میں اپنی اِس بِلّی کے پیچھے اس کو دیکھنے اِدھر آیا تھا لیکن افسوس! وہ اسی جنگل میں جہاں اس وقت میں پڑا ہوں ایک گندے انسان کی ہوس کا شکار ہو کر جان دے بیٹھی۔

"تو یہ — یہ کون تھی؟ اور یہ بلّی کا روپ؟"

"ہاں! بابو جی۔ وہ یہیں بھٹک رہی ہے اس کا کریا کرم ہمارے عقیدے کے مطابق نہیں ہو سکا۔ میری ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اس کے لیے آپ کو میری مدد کرنی ہوگی۔ آپ کے دل میں جھانک کر میں دیکھ چکا ہوں۔ آپ ایک اچھے انسان ہیں ایک ایسے انسان جس میں نیکی کے ساتھ کچھ فطری خواہش بھی ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے۔ آپ نے اس کا بدن دیکھ کر اسے پسند تو کر لیا لیکن اس کو اپنا بنا لینے کا۔ ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لینے کا ایک خیال بھی تو جاگا

تھا آپ کے دل میں اس سے کھیلنے کا نہیں ! یہ لیجیے ۔"

اس نے اپنے آس پاس ٹٹولتے ہوتے لکڑی سے تراشی ہوا ایک مورتی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے جس دن ، جس جگہ آگ میں آپ ڈال دیں گے اس کا کریا کرم ہمارے عقیدے کے مطابق ہوجائے گا۔ اس مورتی کو میں اپنے ہاتھ میں ابھی پکڑ نہیں پایا تھا کہ میں نے اس سیاہ ننگی مورتی کو جھونپڑی کے ایک کونے میں ایک بار پھر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ کچھ لجاتے ، شرماتے !!

"بابو جی۔ آپ یہ ہمارا کام کردیجیے ۔ وہ تو اب آپ کی ہو ہی چکی ہے ، وہ آپ کو مل جائے گی ۔" میں نے جوں ہی مورتی کو ہاتھ میں پکڑا اور اس کونے کی طرف دیکھا جدھر ابھی ابھی وہ کھڑی نظر آئی تھی ۔ وہاں اب ایک سیاہ خوبصورت چمکیلی بلی اپنی تھوتھنی زمین میں بڑے لاڈ سے رگڑ رہی تھی ۔ جب میری نگاہیں ادھر سے پلٹیں اور میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا تو وہ بےجان سوکھی لاش میں بدل چکا تھا۔ میں ایک خوف ایک حیرت کے عالم میں ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسری میں مورتی پکڑے جھونپڑی سے باہر بھاگا ۔

صفدر میاں نے ، کہ جب میں نے اُن کو ڈھونڈ نکالا اور یہ کہانی سنائی تو قطعی یقین نہیں کیا۔ لیکن جو مورتی میرے پاس تھی وہ ضرور اُن کے لیے بھی حیرت کا باعث تھی ۔

تقسیم کے وقت ایک ہنگامے میں جب ہمارے گھر کا سامان جلا تو وہ مورتی بھی جل کر راکھ ہوگئی ۔ اور اس کے بعد ملی تو کہاں ملی کہ خیال بھی نہ تھا جب تک وہ نہ ملی تھی میں کالی رنگت کی دوشیزاؤں کو ہی نہیں کالی بلیوں کو بھی بڑے پیار سے دیکھا کرتا ۔ اور جب میرے بچوں کی ماں مجھے ملی ، اور پھر جب شادی ہوگئی تو اس کو بھی اس کہانی پر یقین نہیں آیا۔ میں اس سے کہتا کہ اس کے خدوخال ، رنگ روپ اور جسم کے پیچ وخم ، اس کی آنکھوں میں چمکتی لپکتی روشنی کی شعاع بالکل وہی ہے جو میں نے اس روز جنگل میں بھری برسات میں دیکھی تھی اور حیرت کی بات یہ کہ جب میں اپنے سُسر سے ملا تو وہ ایک ایسے ہی سوکھے دُبلے اور پتلی آنکھوں والے بوڑھے تھے

جیسا میں نے کسی بوڑھے کو وندھیاچل کی پہاڑوں کے ایک سلسلے کے گھنے جنگل کے نیچے بنی ایک جھونپڑی میں دیکھا تھا۔ وہ کرسچن تھے اور میری بیوی بھی شادی سے پہلے تک کرسچن تھی جو مسلمان ہو کر مریم کہلائی۔

اب اس پہلی عمارت کی جگہ جو نئی عمارت ابھر آئی ہے یہ مکان کے قیام کا دوسرا روپ ہے ہاں! زماں البتہ بدل گیا۔ وقت تو بدلتا ہی رہتا ہے۔ شاید میں بھی جب اپنے بڑے سے مکان کے اپنے سونے کے کمرے میں کسی رات مر جاؤں گا۔ اور زمانہ پھر بدل جائے گا۔ اور میرے لیے مکان کی تبدیلی ایک قبر کے نصیب ہونے کی صورت میں ملے گی۔ کہانی ناقابلِ یقین ہے ! آپ کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔ لیکن زماں و مکاں کے حوالے سے دنیا میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں یا پھر اب اکیسویں صدی کی طرف بڑھتے ہوئے ہم کو نئے تصورات جدھر لے جا رہے ہیں ان پر یقین کر لینے کا سلیقہ انسان کو آگیا ہے۔ یہ بھی سلیقہ آ ہی جائے گا!!!

جب فکر و نظریات اور سائنسی تجربات بدلتے جا رہے ہیں، جب انسان اپنی ہئیت بدل رہا ہے، اس کی ضروریات کی فراہمی اسکی خواہشات کے مطابق ہوتی جا رہی ہے، تو تخیل کی ان کہانیوں کی سچائی کو آنے والے زمانے کے لوگ سچا ثابت کر ڈالیں گے۔ کیا خیال ہے۔؟ کیا سائنس اس سمت نہیں بڑھ رہی۔ ؟؟

(۱۹۹۰ء)

دمے کا شکار معاشرہ ــــــ ایک رپورتاژ

قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں بعض دن یوں خُوں چکاں حوالہ بن جاتے ہیں کہ زخمی قلب سے خون کا رِسنا بند ہی نہیں ہوتا، ایسی ایک زخمی تاریخ ۱۶ر اکتوبر بھی ہے۔ اس تاریخ کے ڈرامے کے اہم کردار کو چاہے شہیدِ ملّت کہو یا وہ مظلوم پرندہ جو دامِ تہہ رنگ کا شکار ہوا اور اپنے پیچھے ایک مجہول روایت کا رِستا ہوا زخم چھوڑ گیا کہ جو وقفوں سے کراچی کو اسیرِ سرخیٔ آلام بنائے جاتا ہے۔

اب تو سیاسی طالع آزماؤں کی تیغِ ستم نے اس حوالے سے شخصیتوں کو اپنے فتنہ دستِ تہہ آموز میں رکھ کر گلستانِ سیاست کی راہ کو فروغ دینے کی رسم کو اس طرح عام کیا کہ سب کچھ اس کے پردۂ زنگار میں چھُپ کر رہ گیا۔ اور اس رسم کو فروغ ہوا کہ "یہ" میرا ہے اور "وہ" بھی میرا ہے ایسی صورت میں بندوق کی گولی اور چھُری کی دھار نہ نام سنتی ہے نہ کسی کی شکل وصورت اور لباس کے ساتھ رنگ ونسل اور علاقے کی پہچان کا تکلف کرتی ہے اور وہ خون کہ جو ۱۶ر اکتوبر کو پہلی بار بہایا گیا تھا اب شہر کے گلی کوچوں سے لے کر قصبوں اور دیہاتوں تک بہا پھر رہا ہے۔ لوگ چہروں، ثقافتوں لباسوں اور لب ولہجے اور زبان کو بھول کر اپنے آپ کے اندر حصولِ قوّت واختیار کے دہکتے الاؤ کی تپش سے دفا، دوستی، رفاقت ہم نفسی کی لطافتوں کو بھُون بھُون کر اپنے آپ نگلتے جا رہے ہیں۔

کس غضب کا ماحول کراچی کا ہو چکا ہے! وہ شہر کو کہ جو سمندر تک اپنے پاؤں پھیلاتا اور اپنے قامت کو بلند کرتا آسمان تک پہنچ رہا ہے اُس کے گلی کوچے پابند آہن و سنگ بناتے جا رہے ہیں تاکہ غول بیاباں کی دست و برد سے محفوظ رہیں لوگ یہ بھول گئے کہ راستوں کے دروازوں کو بند کرنے سے پہلے دلوں کے دروازوں میں اپنے اور دوسروں کے حال و قال اور عمل کو جھانک کر دیکھنا پڑتا ہے کہ جن شیاطین سے وہ پناہ چاہ رہے ہیں وہی تو کہیں وہاں چھپے نہ بیٹھے ہوں!

کیا غضب ہے کہ اس شہر طرح دار اور ہمسایۂ سمندر میں نہ کہیں قحط پڑا نہ دانۂ گندم کا کال ہوا کہ یارانِ شہر کو فراموش کر ڈالیں مگر شہر ہوتا ایسا ہی جا رہا ہے۔ روشنی اور پانی کی بے رنگی نے اس شہر کی فضاؤں کو سیاہ اور اس کے باشندوں کو پتھر کا بنا ڈالا ہے، جو موبل آئل کا دھواں اگلتے ہیں اور بغیر سیڑھی اور سہارا استعمال کیے ہوئے پاتال کے اندھیروں میں ڈوبے چلے جا رہے ہیں۔ شہر کو سرمایہ و محنت کی آویزشوں نے دو حصوں میں اس طرح تقسیم کر ڈالا ہے کہ ایک حصہ تصویر کی صورت اختیار کر گیا ہے تو دوسرا حرماں نصیبی میں ڈھلے لوگوں کی آنکھوں سے بہا ہوا سیاہ آنسو بن کر رہ گیا ہے ان سیاہ آنسو نصیب لوگوں کے ہوش و حواس گم ہیں کہ وہ یہ تک معلوم کرنے کا یارا نہیں رکھتے کہ کراچی کے وہ روشن دن، چمکیلی راتیں اور خوش گوار شامیں، طرح دار صبحیں اور جی دار دوپہریں کون اپنی گون میں سمیٹ لے گیا۔ وہ کون سا بنجارہ ہے کہ جس نے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ سوختہ جانوں کے سوا!

یہ ۱۶ اکتوبر کا ہی دن تھا جب میں جانب خطۂ پنجاب ہوا بردوش تھا اس شہر نا پرساں سے اکتایا ہوا، بے زار اور آزردہ! یہ سب سوچتا ہوا اور یہ بھی کہ کیا یہ ۴۷ سے ۵۳ تک کا وہی شہر ہے کہ جس نے میرا دامن تھام لیا تھا میرے قدم اس سرزمین پر اس طرح جم گئے تھے کہ میں نے اپنی جوانی کا سہاگ اپنی قوت جمال کا نکھار اور فکرِ رسا کا شباب اس شہر

کے قدموں پر نچھاور کر دیا اور جب رگوں میں دوڑتے بھاگتے خون کی تمازت نے برفاب بن کر سر پر سفیدی کے تودے جما دیئے اور برف باریٔ آلام کی دھند میں آنکھوں کی بینائی کجلا گئی تو پتہ چلا کہ:

"میاں اب کیا ڈھونڈ رہو اس خاکستر جاں میں" کتنے مہ و سال بیتے کہ رات کو اس شہرِ دل آزار کے کسی گوشے سے بھی نہ مٹھی بھر ستارے آسمان پر دیکھنے نصیب ہوئے اور نہ کسی سبزہ زار کے دامن نے نگاہوں کو اسیر کیا، نہ کسی خوشبو نے جاں فزا کی کوئی رمق نصیب ہوئی نہ کانوں کو فطرت سے قریب تر کسی ساز کی بھولی بسری آواز! بے ہنگم آوازوں بے رحم تڑی بسی ہواؤں اور اکھڑی اکھڑی راہوں نے وہ سب ذوق شوق کے حوالے، بے مصرف گزرنے والے وقت کے ریگ مال سے ذہن سے اس طرح رگڑ کر صاف کر ڈالے کہ جان و تن کی کھال تک ادھڑتی اور اکھڑتی چلی گئی۔

"کیا یہ وہی شہرِ کراچی ہے کہ جہاں "چاکی واڑہ میں وصال" لکھی گئی تھی۔ کیا کبھی یہاں کوئی ایسا شخص بھی رہتا تھا جس نے "ماں جی" جیسی عظیم کہانی تحریر کی تھی۔ کیا یہاں پر ہی رہتے ہوئے قرۃ العین نے افسانے لکھے اور ناولوں کے خاکے بنائے اور ممتاز شیریں نے اپنی الگ راہ بنائی تھی اور کیا یہ وہی پھیلتا شہر کراچی ہے کہ جس کی کچی بستیوں میں گھومتے پھرتے شوکت صدیقی نے خدا کی بستی کا خاکہ تیار کیا اور ایک غیر معمولی ناول اردو ادب کو دیا اور اس کراچی کی فضاؤں میں فیض نے کوئی شعر کہا تھا کیا کبھی یہاں پر ہی کسی نے ٹائز جی ٹیوب جی کا پتہ چلایا تھا؟ کیا ابراہیم جلیس کے قدموں کی دھمک سے اس شہر کی سڑکیں آشنائی رکھتی تھیں۔ کیا یہ وہی کراچی ہے کہ جس میں تنگی ترشی سے زندگی بسر کرتے ہوئے طفیل احمد جمالی "گر تو برا نہ مانے" جیسا کالم لکھا کرتا تھا۔ کیا اندھیروں کا راج ہوتے ہوئے یہاں سویرا تلاش کرنے کے لیے مولوی عبدالحق نانک واڑہ سے کلفٹن تک اپنی بزرگانہ جوانی سے چہل قدمی کرتے ہوئے اردو کو فکر و عمل

کے سانچے میں ڈھالے جانے کی منصوبہ بندیوں میں گم رہتے تھے۔ یہاں پر ہی کیا حفیظ ہوشیار پوری کی غزل کا طنطنہ گونجا تھا۔ یہاں کیا کوئی بخاری بھی بخار اوڑھے بغیر سڑکوں پر گھوما کرتا تھا! کیا یہی وہ شہر ہے کہ جہاں شاہد احمد دہلوی کی ادب اور گائیکی کے لباس سیے گئے تھے۔ کیا یہاں عالی جی شاعری کی رادھاؤں میں کنھیا بنے مکھن کی چوری میں پیش پیش نہ رہے اور دوہوں کی تانیں نہیں اُڑائیں؟ کیا سبطِ حسن نے سیاست فلسفے اور ادب کو تاریخ کے بند دریچوں سے آگے نہیں کھینچ بلایا؟ ممتاز حسین نے نقد و ادب کو سمجھنے میں مدد کے لیے اپنی گنجلک تحریروں کی بند سیپیوں سے گوہر آبدار نہیں نکالے کیا یہیں پر جمیل جالبی نے تحقیق کے نئے گوشے وا نہیں کیے؟ شگوفے نہیں کھلائے؟ کیا یہیں کہیں بے نام محبوب کی تلاش اور اس کے دیدار کی وحشت میں عزیز حامد مدنی نے جمشید روڈ سے جناح روڈ تک چکر کاٹ کر کیا ہیروں جیسے شعر نہیں تراشے؟ کیا یہاں پر ہی سرخ و سبز، آجر و اجیر کی آویزشوں نے سڑکوں پر مارچ نہیں کیا اور پھر جیلوں کی طرف اُن کو دھکیلا گیا۔ کیا یہاں عظیم کتابیں، رسالے، اخبار اور میگزین نہیں نکالے گئے۔ یہیں ریلنز کافی ہاؤس میں سرشار صدیقی شاہد عشقی اور حمید کاشمیری کی نشستیں نہیں رہا کرتی تھیں۔ یہیں پر کیا سلیم احمد "نئی نظم اور پورا آدمی" کی تلاش میں سڑکوں پر نہیں گھومتے رہے؟ کیا یہیں انشا جی نے کوچ کرنے سے پہلے اپنے محبوبوں کا پردہ رکھنے کے لیے چاند کی سُندر چاندنی کو نہیں جھٹلایا تھا؟"

یہ سب آخر ہوا کیا اور کیسے ہوا؟ پہلے علاقے، روشنی اور اندھیروں کے حوالے سے تقسیم ہوئے اور پھر فکر و ذہن تبدیل ہوئے اور بالآخر زبان کے حوالوں سے سفید پوش اور بے لباس لوگ بھی، بڑی بڑی "بیچارو"، جیپوں کی تیز رفتاری سے ایک سمت سے دوسری سمت میں بٹ گئے۔ اب نہ شعر و ادب کی محفلوں کی وہ رونق رہی کہ جو اس نئے اُبھرتے صنعتی شہر میں ایک نئی تہذیب اور ثقافت کے پروان چڑھنے کے حوالوں سے کہیں نہ کہیں

کسی نہ کسی طرح جمتی رہتی تھیں۔ اب تو سفید کاروں کے خوف نے چند ضرورت مندوں کو سرِ راہ گزرتے ہوئے بھی خوف کی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

لوگ یوں تو اب بھی انہی سہمے ہوئے شہروں کے گلی گلیاروں اور صاف شفاف شاہ راہوں پر بنے مکانوں میں رہتے ہیں لیکن اصل شہر کو جیسے کسی انجانے توی ہیکل درندے کے سایے نے اُچک لیا اب شہر نہ کسی کی نگاہوں میں رہا نہ دلوں میں۔!"

تو میں ہوائی جہاز میں کراچی سے لاہور جا رہا تھا اس طرح کسی آشنا اور شناسا کے بغیر سفر کرو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ناشتہ کر لو، کھانا کھا لو یا پھر اونگھتے رہو۔ تو میں بھی یہ سب نوحے پڑھتا ہوا، اونگھنے لگا اور عجیب سوتے جاگتے خواب کے تانے بانوں میں اُلجھتا چلا گیا۔ میں نے آنکھوں کے خوابیدہ پردوں پر دیکھا کہ ـــــ

"میں اس کے مکان کے اس کمرے میں بیٹھا تھا جس کو اس نے اپنے سونے کے کمرے سے لے کر ڈرائنگ روم تک بنا رکھا تھا، وہ دمے کا مریض ہو چکا تھا اور اب دمے کے شدید دباؤ میں آکر چلنے پھرنے سے بھی معذور تھا۔ اب اس کی زندگی کا دار و مدار عارضی طور پر سانس بحال کر دینے کی اس ٹیوب پر تھا جو وہ ٹھہر ٹھہر کر منہ کے ذریعے سے سُڑکتا رہتا تھا اور جب اس میں شدت آجاتی تو اس کے پیاروں نے اس کے لیے آکسیجن گیس کا جو سلنڈر اس کے سرہانے لا رکھا تھا اس کی نلکی ناک میں لگا لیتا اور پڑا ہوا چھت کو گھورتا رہتا اس کو اب یقین آچلا تھا کہ اس کے آخری دن آپہنچے ہیں۔ جب دمے کی تکلیف سے نجات ملتی تو وہ اپنی ایک تفصیلی وصیت کو تحریر کرتا رہتا، یا اپنے بھولے بسرے اور دور رہنے یا نزدیک آسکنے والے دوستوں کو خط لکھتا رہتا یا اچھے دنوں کے خوابوں میں الجھا رہتا لیکن اللہ رے! اُس کی خوش طبعی اور خوش مزاجی کہ وہ روتے بسورتے جان ہارنے کا قائل ہی نہیں تھا۔ جب بھی اس کو دیکھو تو وہ شدید تکلیف میں بھی مسکرا اُٹھتا۔ ایسے ہی ایک دن جب میں اس کے پاس بیٹھا تھا اس نے مجھ سے پوچھا، "کیا واقعی ہم پینسٹھ سال کے ہو گئے ہیں؟"

" اس میں کوئی شبہ ہے کیا؟ ہم دونوں کو اپنی اپنی تاریخ پیدائش معلوم تو ہے حساب لگالو"

" مجھے یقین نہیں آتا کہ ہم اتنا عرصہ اس دنیا کی تکالیف میں گزار چکے ہیں "

" تکالیف ہی کیوں؟ کیا ہم نے یہاں خوشیوں سے اپنے دامن نہیں بھرے؟"

" کون سی خوشیاں؟ کیا بی ہائینڈ جیکب لائن کے سرکاری کوارٹروں کے چھوٹے کمروں اور دالان میں موسمِ برسات کی بھیگی راتوں میں اپنی اپنی بیویوں سے جُدا جُدا ترستے رہنے کی خوشیاں؟ کیا وہ گرم تپتے دن اور اُن کی شامیں جب چاروں طرف سے گرم بھبکے بدن کو جُھلسائے رہتے تھے؟ کیا وہ شام کے دھندلکوں میں چولہوں کے آگے بیویوں کے پھول سے مرجھائے چہرے اور راکھ میں لتھڑے اُن کے کالے بالوں پر جمی سفیدی کے جالے!!

اور پھر بے لذت سالنوں میں ڈبو کر پانی سے حلق میں اتارے جانے والے لقموں کی حلاوت!! جہاں اپنی بیویوں سے اپنے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کے سامنے ان کی اس آزار نصیبی پر دو لفظ بھی محبت کے کہنے پر پابندی تھی! وہ نگراں آنکھیں!!! میاں چھوٹو! بڑے لوگ مال داروں کی دولت چراتے ہیں، وقت نے ہم سے ہماری زندگی کے قیمتی لمحات چھین کر ہم کو بدحالی کے ساتھ یہاں تک پہنچایا ہے۔ تم چاہو تو اس گزرے وقت کے لمحوں کو ربڑ کی طرح کھینچ کر ایک سو پینسٹھ بھی کہہ سکتے ہو؟"

" نہیں دوست! یہ بات نہیں!

تکلیف اور اذیت کو بھی اگر خوش گواری کی بھوبھل میں رکھ کر تاؤ دیا جائے تو اس کی لذت خستہ شکر قندیوں سے کم نہیں ہوتی ہے!"

" یار تمھارے اسی اندازِ فکر اور صبر کے ساتھ اپنی مصیبت کو انگیز کرتے ہوئے مسکراتے رہنے نے تو تمھیں کھا لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ غم کو چھپائے رکھنے کی عادت ہی نے تم سے تمھارا رنگ روپ چھین لیا تمھاری جوانی ملیامیٹ کر ڈالی اب تو تمھارے چہرے پر مسکراہٹ، آنکھوں میں مایوسی اور محرومی کی پرچھائیاں اُتر آتی ہیں اور یہاں تک

آپہنچے ہو کہ اب تو تم سے کھانسا بھی نہیں جاتا اور ڈھنگ سے گفتگو بھی نہیں کی جاتی ۔"

میری جان! تم نے کبھی خود بھی اپنا چہرہ مہرہ آئینے میں دیکھا ہے جس چہرے پر کتنے حسینوں نے اپنی چاہت کے آنچلوں کے سائے کیے رکھے ذرا اپنے چہرے کو تو دیکھو

کیا وہ یہی تھا۔ کیا گزرتے وقت کی ڈھلتی دھوپ نے اس کو نہیں مرجھا ڈالا۔ یہ درست ہے کہ تم اظہارِ غم و غصہ پر قادر ہو، پھر بھی چہرہ دھواں دھواں رہنے لگا ہے۔ لکھ کر اپنے دل کا بوجھ اتار لیتے ہو، اندر کے جمع شدہ کاٹھ کباڑ کو باہر نکال پھینکتے ہو۔ لیکن کیا تم کو بچپن سے جاننے والا یہ نہیں سمجھ سکتا کہ تم کیا کچھ اپنے اندر چھپائے پھرتے ہو۔"

"بھائی تو پھر پینسٹھ سال کی دھوپ کی کچھ تو تمازت ہمارے حصے میں بھی رہنے دو۔ چاہے چہرہ تانبے جیسا ہو جائے یا بال چاندی جیسے دل تو سونے جیسا رکھنا چاہیے۔ تم تو اپنوں پرایوں کا غم کھاتے کھاتے خود ایک کوہِ نور ہیرا بن گئے ہو۔"

"لیکن یہ ہیرے تو اب قصہ کہانیوں کی ہی زینت رہ گئے ہیں یار!"

اتنے میں چائے آگئی۔

اس کے بیمار ہو کر بستر پر دراز ہو جانے پر، میں نے یہ اپنا معمول بنا لیا تھا کہ ہفتہ میں ایک دن اس کے پاس ضرور جاتا اور ہم دونوں مل کر پہلے اپنی اپنی طبیعتوں کی بحالی اور بیماری کا ذکر کرتے اور پھر بھابی اور اس کے بچے ہمارے لیے چائے بھیج دیتے اور دو تین گھنٹے کے بعد جب میں اجازت چاہتا تو اس کے چہرے پر بشاشت ہوتی اور اس کا

نڈھال اور سوکھا ہوا جسم جوانی کی تابانی کی بچی کھچی تنویر کو کہیں سے کھینچ کھانچ کر ایک ردائے مسرت وشادمانی کے طور پر اوڑھ لیتا ۔ چائے کے تکلفات دیکھ کر میں مصنوعی غصّے کا اظہار کرتا تو وہ کہتا ۔

" میرے بھائی ۔ یہ صدر کا کیفے ٹیریا یا کیفے جارج تو ہے نہیں جہاں کی پے ٹیز اور ٹماٹو ساس کا مزہ ہمارے ساتھ اڑاتے رہے ہو ۔ یہ تو اس گھر کی تواضع ہے مزے دار نہ سہی ، خلوص کی لذّت سے تو بھری ہوئی ہے ۔"

یہ سچ تھا کہ ہم نے اپنی جوانی کے کئی سال ، سڑکوں پر گھومتے گزارے ۔ اس زمانے میں کراچی کے صدر کے علاقے میں رونق تو ہوتی تھی اور چہل پہل بھی لیکن اس میں نظم و ضبط بھی ہوتا تھا کبھی کبھار کاندھے سے کاندھا بھی چھل جاتا تھا لیکن آج کل کا سا سماں نہ تھا کہ اب نہ کوئی صدر میں فٹ پاتھ رہا ہے نہ چلنے پھرنے کی گنجائش اور نہ فٹ پاتھ پر دو ساتھیوں میں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہیں رک جانے کی قوت ! اگر رک گئے تو بچھڑ گئے ۔ اب تو مدقوق لوگوں کے رنگ والی زرد منی بسیں ، انسانوں کا خیال کیے بغیر ہر سامنے آجانے والی رکاوٹ کو روندتی گزرتی چلی جا رہی ہیں ! اب نہ صدر کے علاقے میں اچھے کیا بُرے کیفے رہے اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ کہ جہاں فکر و دانش والے بیٹھ سکیں ۔ اب تو ان کا بھی اسٹیٹس بڑھ گیا ہے ، جبیں ہوٹل جا بیٹھتے ہیں ! اور دور دراز کے کم یافت ادیب وشاعر کہ جو لانڈھی سے لے کر نیو کراچی تک رہتے ہیں وہ ان ادیبوں کو ہی اب بورژوا کلاس کے لوگ سمجھنے لگے ہیں اور اب تو ستم یہ ہے کہ جدلیاتی فلسفے پر یقین رکھنے والے بھی اس جدلیاتی عمل کو تسلیم کرنے کے بجائے بہلاتے تلاش کرنے لگے ہیں کہ کسی طرح ان کی ذات محفوظ رہے اور حقیقت سے آنکھیں چار نہ ہوں اور وہ کہ جو دائیں بازو والے خود کو کہلواتے تھے اب دائیں بائیں بازو کی بغلیں بجا کر خوشی کا بھونڈا اظہار کر رہے ہیں ۔ شاید انھوں نے سوچنے ، فکر کرنے ، حالات کو سمجھنے اور سمجھانے کی طرف سے آنکھیں موندلی ہیں ان

دائیں بازو والوں کے خیال میں انھوں نے بائیں بازو والوں کو چت کر دیا ہے۔

اب نہ رات کے وقت سردی کے سناٹے میں کوئی "بھُری ہو رہی ہے گزک" کی آوازیں بی ہانڈ جیکب لائن سے آتی ہیں نہ مونگ پھلی والوں کی آوازیں ابھرتی ہیں۔ یہاں کے لوگ اب قبرستانوں میں جا سوئے ہیں یا رات کے سناٹے میں گولیوں کی آواز کے بعد یہاں وہاں سے اُن کے جنازے صبح کو قبرستان پہنچا دیے جاتے ہیں۔ اب تو نہ تعزیت کرنے کے لفظوں میں معنی رہے ہیں نہ کہنے والی آواز میں رقت اور نہ تاثر!

اب مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں لانڈھی سے لے کر اورنگی ٹاؤن کے علاقوں تک کے جلنے برباد ہوتے یا ڈھا دیے جانے والے مکانوں کے کھنڈرات کے کسی گھنے درخت کی شاخ پر بیٹھا آدھی رات کے بعد اس سے باتیں کر رہا ہوں۔ شاید ہم دونوں اب "اُلّو" بن چکے ہیں۔ اُلّو جو رات کو بولتے ہیں اور جب بندو خاں مرحوم کی کباب کی دوکان کا علاقہ بھی سنسان ہو جاتا ہے تو ہم ناظم آباد سے ہوتے ہوتے نارتھ ناظم آباد جا پہنچتے ہیں اس کے پاس ہی ناگن چورنگی کا وہ حصّہ ہے کہ اب جو اس پھیلنے اور پھیلتے چلے جانے والے شہر کا وسط بنتا جا رہا ہے۔ یہیں سخی قبرستان ہے وہ اسی میں دفن ہے!

جب رات ڈھل جاتی ہے تو وہ درخت کی شاخ سے اُڑ کر اپنی قبر میں جا گھستا ہے اور میں اپنے کمرے کے اس جھلنگے پلنگ میں جا سماتا ہوں جس کے ساتھ والے کمرے میں میری کبھی کی خوب صورت اور غیرت ناہید، زہرہ صفت بیوی کہ جو، اب دادی بھی ہے اور نانی بھی، اپنے نواسی نواسوں اور پوتا پوتیوں کے ساتھ سوتی ہے لیکن درمیان کا دروازہ کھُلا رکھنے پر ضد کرتی ہے کہ اس کے بند ہونے سے اس کا دل گھبراتا ہے۔

میرے کان میں پڑنے والی اس آواز نے مجھے ہوشیار کر دیا "مہربانی فرما کر اپنی پیٹیاں کس لیجیے۔"

جہاز اب لاہور کے ہوائی اڈے پر اُتر رہا تھا۔ لاہور جہاں سبزہ ہے، پھول

ہیں، رنگ برنگی روشنیاں ہیں۔ جہاں کے لوگ محرومیوں اور وقت کی نامہربانیوں کے باوجود زندہ دل ہیں۔

جہاں شاہی قلعہ بھی ہے اور شالامار باغ بھی، جہاں مینارِ پاکستان بھی ہے اور اسلامی سربراہ کانفرنس کے انعقاد کا نشان بھی مگر اب بھی یہاں غلیظ گلی کوچے ہیں اور کچی اور گندی آبادیاں بھی!

اس بار میں نے محسوس کیا کہ ہماری سیاسی عمروں نے یہاں بھی انسانوں کے ذہن و دل کو تقسیم کر رکھا ہے اور وہ انسانی رفاقت جو اس شہر کی صفت تھی۔ اب اس پر سیاسی دھول اور خاک ڈالی جا رہی ہے انسان کو انسان سے الگ کر کے اس کو رات کے خوگر اڑنے والے تنہا جانور میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ چاند ستارے یہاں کراچی سے زیادہ شاندار اور چمکیلے نظر آتے ہیں۔ مگر دل درماندہ اور ناآسودہ ہوتے جا رہے ہیں، ذہن کے دریچے بند ہو رہے ہیں اور فراخیٔ قلب سکڑ رہی ہے۔ پرانے دوست ایک دوسرے کو خوش آمدید کہنے سے گریزاں ہیں۔ "ہیجا رو" جیپوں کا کلچر یہاں بھی سڑکوں کو روند رہا ہے۔ گھوڑا تانگہ ہے رکشے بھی ہیں لیکن نامہربان چہرے اپنے کاندھوں پر سجائے ہوئے۔

جب لاہور سے کراچی واپس ہو رہا تھا تو میں نے سوچا

یہ سب کچھ دیہی علاقوں میں "خدا بنے ہوئے" زمینداروں اور جاگیرداروں نے اب ملک کے سرمایہ داروں سے مل کر انسان کو کولہو کا بیل بنا کر ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی ہیں اور کیا کراچی اور کیا لاہور۔ یہاں سے وہاں تک سب انسانوں کو جانوروں کی صورت میں ایک ہی دائرے میں گھمایا جا رہا ہے۔ دنیا کی مضبوط دیواریں جو انسانوں کو جدا کرتی تھیں وہ تو ٹوٹ رہی ہیں اور ہمارے یہاں ہر دل میں دیواروں کو کھڑا کیا جا رہا ہے۔ اور ہمارے معاشرے اور معیشت کے چوکیدار اس حقیقت کو بھلا بیٹھے ہیں کہ آنکھوں پر مدت تک بندھے رہنے والے سیاسی کٹورے جب ٹوٹتے ہیں تو آنکھیں اپنوں اور غیروں کی پہچان

S. No. ....
COLLECTION

اور شناخت سے محروم ہو چکی ہوتی ہیں۔ بالکل کلاشن کوف کی اس نالی سے نکلنے والی گولی کی طرح جو کسی کو نہیں پہچانتی۔ جب تہذیبیں اور ثقافتیں بے دردی سے ذبح کر دی جاتی ہیں اور انسان جب اپنی روایتوں کی ردائیں اتار کر پھینک دیتا ہے تو ان جسموں کے بھیانک اور وحشت زدہ بھوت پلید ننگ دھڑنگ ہو کر اجالوں کو اپنے اندھیروں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ نہ شعر نہ ادب نہ افسانہ کوئی بھی کہیں باقی نہیں رہتا تاہم فطری تقاضوں کے مطابق انسان پھر بھی بچ ہی رہتا ہے جس سے اجڑی ہوئی دنیا کے پھر سے آباد ہونے کی نوید ملتی ہے۔

" ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی جبانت دشمن دھول اور خاک سے ہی تو قدرت نے نئی کونپل کو جنم دیا تھا۔ چھوٹی بڑی جنگوں کے طوفانوں سے نکل کر ہی تو نئے شہر نئی بستیاں نئی ٹیکنالوجی اور سوچ اور نئے خیال اور نئے نظام جنم لیتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے تو یہی سبق ملتا ہے میں نے اس طرح بھی سوچا کہ ہم اور ہمارا معاشرہ دمے کا شکار ہو گئے ہیں شاید ہم کو اب مصنوعی ذریعے سے آکسیجن کی فراہمی بھی واپس اس صحت مند مقام پر نہیں لا سکتی جہاں پھر سے گم شدہ رونقیں اور انسانی رفاقتوں کی دل شکنی لوٹ آئے۔ موت اب شاید اس کا مقدر بن رہی ہے لیکن نئی ضرورتیں نئے ارادوں اور نئی تمناؤں اور آنے والی صدی کی صداقتوں کے ساتھ انسانی اعتماد کو مضبوط بنانے کی اہل ہو چکی ہے۔" یہ وہ موقع تھا جب میں لاہور کی سرسبزی اور رونق سے بھی مایوس ہو کر کراچی کی طرف محو پرواز تھا۔ ایک دکھ کے ساتھ ہی میرا ذہن آنے والی صدی آنے والے عشروں کی نہ میسر آنے والی لطافتوں اور صداقتوں کی شیریں سخنی سے سرشار تھا۔

اللہ! کیا صدی ہو گی وہ بھی کہ جب نہ ہم ہوں گے اور نہ یہ پھولوں کے نیچے سے ابھرنے والے کانٹوں کی چبھن۔ ہاں! نئے انسان کے گوشت پوست اور رگوں میں ہمارے ہی خون کا بلاوا ہو گا۔ (۱۹۹۰ء)

۱۹۸۸-۸۹ کا معیاری، موضوعاتی اور اشاعتی خوبیوں کا منتخبہ ناول

ایک ناول

مٹھی بھر ہوا

کوکب جمیل

نیشنل بک کونسل آف پاکستان نے جس کو گراں قدر اعزاز اور سند توصیف سے نوازا۔

مکتبہ بھوپال پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۸۲ - حیدری پوسٹ آفس نارتھ ناظم آباد کراچی - ۷۴۰۰۰